

TIGHT BINDING BOOK

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222553

UNIVERSAL
LIBRARY

OUP-67-11-1-68-5,000.

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No.

۸۹۱۵ ۳۰۸

Accession No.

۴۵۹۹

Author

رسل محمود سید

Title

مستاد و کرکوت

This book should be returned on or before the date last marked below.

مستند اردو کے نمونے

مرتبہ

سر سید اس مسعود بی۔ ۱۰۷۱۔ آکسن مرعوم

شائع کردہ

نظامی پریس مکیا کھنسی بدایون

۱۹۲۳ء

دو روپیے

(عجا)

قیمت

پبلشر کی گزارش

مستند اردو کے نمونے

یہ کتاب اردو کے مشہور اور مستند مصنفین کے مضامین کے انتخابات کا مجموعہ جس کو شوالہ میں سرسید راس مسعود مرحوم جیسے فاضل ادیب نے قوم کے ان بچوں کے لئے جو صحیح اردو ادب کو سیکھنا چاہتے ہیں تالیف کیا تھا اب ہم اس مجموعہ کو دوبارہ شائع کر رہے ہیں تاکہ مؤلف کی یادگار اردو ادب میں تازہ رہے اور موجودہ نسل اس سے فائدہ اٹھا سکے۔

خاکسار

اچیت الدین

نظامی پریس ہادیوں

۱۹۳۳ء

فہرست مضامین

۲۰۰

صفحہ	نام مصنف	عنوان مضمون	صفحہ	نام مصنف	عنوان مضمون
۱۲۱	غالب	اے تازہ واردان بساط ہنود	۱	سریہ جواں	دعا
۱۲۲	اقبال	ایک پرندے کی فریاد	۲	"	گزارا ہوا زمانہ
۱۲۳	ناظر	جوگی	۱۰	"	بحث و تکرار
۱۲۸	انشا	کمر بندھے ہوئے چلنے کو سہم	۱۴	"	خوشامد
		یار بیٹھے ہیں	۱۸	"	تقصیب
۱۲۹	غالب	لازم تھا کہ دیکھو مرثیہ کوئی ہنر	۲۶	محمد حسین آزاد	شہنشاہ اکبر
۱۳۰	"	سب کچھ ہلا کر لے لیا گنگو	۳۶	"	ابوالفیض نعیمی فیاضی
۱۳۱	"	ہو یا بسی جگہ لکھ رہا کوئی ہنر	۴۱	"	شہرت عام اور بقا کو دوام
۱۳۲	"	ابن مریم ہوا کرے کوئی			کا دربار
۱۳۳	"	کوئی امید بر نہیں آتی	۶۹	غیر مرزا بی	سوتاڑہ
۱۳۳	"	رات دن گردش میں ہیں اسماں	۷۷	وقار الملک	ہمان و میربان
۱۳۴	"	سہرا	۹	انیزیل سی محمود	دوستی کا بڑاؤ
۱۳۶	ذوق	سہرا	۱۰۸	مولوی عبدالحق	محسن الملک مرحوم
۱۳۸	"	کستی کی کئی سیل و گمراہ تو کیا	۱۱۴	محمد فاروق دیونا	شاعری
"	غالب	دل ناداں تجھ کو کیا ہی			حصہ کا نظم

صفحہ	نام مصنف	عنوان مضمون	صفحہ	نام مصنف	عنوان مضمون
۱۶۳	احسن مارہروی	غوسہ بلی و ماتم حاکمی	۱۳۹	میر انیس	گزنہ کا بڑھ بڑ گردن پر
۱۶۰	مرزا دبیر	بلی کی محبت			ہم اٹھ سکے چلے
۱۶۴	بیخود بدایونی	شباب و شبیب	۱۴۰	سید علی محمد و	درارج و دوستی
۱۶۵	ذوق	ہاتھ اور گھوڑے کی تعریف	۱۴۱	"	دنیا کے لطافتات
۱۶۹	حالی	بہ نوا سنسٹ	۱۴۲	"	پٹنہ کے سنگ شرف
۱۸۱	اکبر	راہبیاات و لطافتا	۱۴۳	"	سیر علی البید
۱۵۰		ایک آرزو	۱۴۴	سرد جہاں آبادی	وصفہ جہاں
۱۹۰	بیخود بدایونی	راہبیاات	۱۴۹	میر انیس	گھوڑے کی تعریف
۱۹۳	مصطفیٰ خان شفق	گزنی بلی امدت کی یاد	۱۵۱	دراغ دہوی	شاہ دکن کی تعریف
۱۹۴		غزل	۱۵۱	بیاں یزدانی	تسلیہ
۱۹۵	جہاں الدین بٹ برنی	سراپا	۱۵۲	میر انیس	راہبیاات معرفت الہی
۱۹۶	محسن کاکوروی	پیاری بایں			وغیرہ
۱۹۹	ڈاکٹر نذیر احمد	طبع نفی و انگریزی کا ملاپ	۱۵۶	حالی	زمرہ قیصری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دُعا

(از انجیل ڈاکٹر سید مرحوم)

اے ہمارے مقدس خدا تیرا نام ازل سے مقدس ہے۔ اے قدوس مطلق
 تیرا نام ابد تک مقدس رہے گا۔ اے ذات پاک تو اپنے آپ ہی مقدس ہے۔
 اگر سارا جہان تیری تقدیس کرے جب بھی تیرے مقدس ہونے میں کچھ
 زیادتی نہیں۔ اور اگر کوئی بھی تجھ کو مقدس کہہ نہ پکارے جب بھی تیرے مقدس
 ہونے میں کوئی کمی نہیں۔ ہم تیرے عاجز بندے تیرا نام لینے کو مسجدیں بناتے
 ہیں۔ تیرا نام پاک اُن میں لیتے ہیں۔ اُس کے محرابوں میں کھڑے ہو کر
 تجھ مقدس کو مقدس کہہ پکارتے ہیں۔ وہ عمارتیں کچھ ہمارے گھر نہیں ہیں۔
 اور نہ تو کسی کا محتاج ہے۔ مگر خاص تیرا نام لینے سے وہ عمارتیں تیرا گھر کہلاتی
 ہیں۔ ہم خود جانتے ہیں کہ وہ اینٹ پتھر جو اُن عمارتوں میں لگتا ہے کچھ مقدس
 نہیں ہے اور عمارتوں کی خوبصورتی اور عالی شانی کچھ مقدس نہیں ہے بلکہ تیرا نام
 مقدس ہے تیرے نام سے تیرا گھر مقدس گنا جاتا ہے۔ پھر جیسے کہ تو تمام جہان کا
 مالک ہے تو اپنے اُس گھر کا بھی مالک ہے۔ خواہ تو اُس کو آباد رکھ خواہ تو اُس کو
 ویران رکھ۔ اور تیرا نام ویسا ہی مقدس ہے جیسا کہ ازل سے ہے اور ابد تک

رہے گا۔

اے خدا اکبر آباد کی یہ جامع مسجد تیرا مقدس نام لینے کے لیے بنائی گئی تھی۔ اُس کے پتھر جن سے یہ بنی ہوئی ہے کچھ مقدس ہونے کے لائق نہ تھے۔ مگر تیرے مقدس نام نے جو اُس میں لیا جاتا تھا اُس کو مقدس ٹھہرایا تھا۔ ہم تیرے گنہگار بندے جو سر سے پاؤں تک گناہوں کی نجاست میں آلودہ ہیں تیرا مقدس نام لینے کے لائق نہیں ہیں۔ تیرا فضل اور تیرا احسان ہی جو ہماری ناپاک زبان سے اپنا مقدس نام لیواتا ہے۔ یہ بات بہت ظاہر ہو کہ اینٹ اور پتھر جن سے تیرا مقدس نام لینے کو تیرا گھر بنایا گیا ہے کسی گنہ سے گنہگار ہونے کے لائق نہ تھا۔ ہماری شامت اعمال اور ہمارے دل کی برائیوں کی سرایت نے ہم کو ایسا ناپاک کر دیا تھا کہ خود ہمارے جسم اس لائق نہ رہے تھے کہ تیرے مقدس نام کے گھر میں بھی داخل ہوں۔ اے خدا تو نے ہمارے گناہوں پر نظر نہیں کی۔ اے خدا تو نے اپنی رحمت ہم گنہگار بندوں پر کی۔ اے مقدس تو نے ہمارے ناپاک جسموں کو اپنے رحم سے قبول کیا۔ اے خدا تو نے اپنے فضل سے ہمارے حاکموں کے دل میں ڈالا کہ پھر تیرے اس گھر میں تیرا نام لیں۔ تیرے نام کی ستائش کریں۔ تجھ قدوس کو مقدس کہہ پکچاریں۔ پس ہم تیرے بندے تیرا شکر بجالاتے ہیں۔ اور اُن حاکموں کو جنہوں نے تیرے مقدس نام کا ادب کیا۔ دل سے دعا کر رہے ہیں۔ اے پاک پروردگار تو ہمارے اس

ناچیز شکر کو اور ہماری اس دعا کو اپنے فضل سے قبول کر۔ اور جیسے کہ تو
مقدس ہی ہمارے بدن اور ہمارے دل اور ہماری جان اور ہماری روح
کو اپنے لیے مقدس کر اور گناہوں سے بچا۔ اور اپنی خاص مرضی پر چلا۔ اور
اپنے گھر کو اپنے مقدس نام سے آباد رکھ۔ آمین

گزرا ہوا زمانہ

(از آنریبل ڈاکٹر سید مرحوم)

برس کی اخیر رات کو ایک بُدھا اپنے اندھیرے گھر میں اکیلا بیٹھا ہی۔
رات بھی ڈراؤنی اور اندھیری ہی۔ گھٹا چھا رہی ہے۔ بجلی تڑپ تڑپ
کر کڑکتی ہے۔ آندھی بڑے زور سے چلتی ہے۔ دل کانپتا ہے اور
دم گھبراتا ہے۔ بُدھا نہایت غمگین ہے۔ مگر اُس کا غم نہ اندھیرے گھر پر ہی
نہ اکیلے پن پر اور نہ اندھیری رات اور بجلی کی کڑک اور آندھی کی گونج
پر اور نہ برس کی اخیر رات پر۔ وہ اپنے پچھلے زمانے کو یاد کرتا ہے اور جتنا
زیادہ یاد آتا ہے اتنا ہی غم بڑھتا ہے۔ ہاتوں سے ڈھکے ہوئے مُنہ پر
آنکھوں سے آنسو بھی بہے چلے جاتے ہیں۔

پچھلا زمانہ اُس کی آنکھوں کے سامنے پھرتا ہے۔ اپنا لڑکپن اُس کو

یا داتا ہے۔ جبکہ اُس کو کسی چیز کا غم اور کسی بات کی فکر دل میں نہ تھی۔ رُبوبہ اشرفی کے بدلے ریوڑ سی اور مٹھانی اچھی لگتی تھی۔ سار اگھراں باپ۔ بھائی بہن اُس کو پیار کرتے تھے۔ پڑھنے کے لیے چھٹی کا وقت جلد آنے کی خوشی میں کتا میں بغل میں لے کتب میں چلا جاتا تھا کتب کا خیال آتے ہی اُس کو اپنے ہم کتب یاد آتے تھے۔ وہ اور زیادہ غمگین ہوتا تھا۔ اور نئے اختیار چلا اٹھتا تھا۔ ہائے وقت ہائے وقت ہائے گزرے ہوئے زمانے۔ افسوس کہ میں نے مجھے بہت دیر میں یاد کیا۔

پھر وہ اپنی جوانی کا زمانہ یاد کرتا تھا۔ اپنا سُرخ سفید چہرہ۔ سڈول۔ ڈیل بھرا بھرا بدن۔ رسیلی آنکھیں۔ موتی کی لڑی سے دانت۔ اُمنگ میں بھرا ہوا دل۔ جذبات انسانی کے جوشوں کی خوشی اُسے یاد آتی تھی۔ اُس آنکھوں میں اندھیرا چھائے ہوئے زمانے میں ماں باپ جو نصیحت کرتے تھے اور نیکی اور خدا پرستی کی بات بتاتے تھے۔ اور یہ کہتا تھا کہ ”آہ ابھی بہت وقت ہے“ اور بڑھاپے آنے کا کبھی خیال بھی نہ کرتا تھا۔ اُس کو یاد آتا تھا اور افسوس کرتا تھا۔ کہ کیا اچھا ہوتا اگر جب ہی میں اس وقت کا خیال کرتا اور خدا پرستی اور نیکی سے اپنے دل کو سنوارتا۔ اور موت کے لیے تیار رہتا۔ آہ وقت گزر گیا۔ آہ وقت گزر گیا۔ اب پچھتائے کیا ہوتا ہے۔ افسوس میں نے آپ اپنے تئیں ہمیشہ یہ کہہ کر برباد کیا کہ ”ابھی وقت

بہت ہی۔“

یہ کمکر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ٹٹول ٹٹول کر کھڑکی تک آیا۔ کھڑکی کھولی۔ دیکھا کہ رات ویسی ہی ڈراؤنی ہی۔ اندھیری گھٹا چھا رہی ہو۔ بجلی کی کڑک سے دل پھٹا جاتا ہے۔ ہولناک آندھی چل رہی ہو۔ درختوں کے پتے اڑتے ہیں اور ٹٹنے ٹٹتے ہیں۔ تب وہ چلا کر بولا ”ہائے ہائے میری گزری ہوئی زندگی بھی ایسی ہی ڈراؤنی ہو جیسی یہ رات۔ یہ کمکر پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اتنے میں اُس کو اپنے ماں باپ بھائی بہن۔ دوست و آشنا یاد آئے۔ جن کی ہڈیاں قبروں میں گل کر خاک ہو چکی تھیں۔ ماں گویا محبت سے اُس کو چھاتی سے لگائے آنکھوں میں آنسو بھرے کھڑی ہی یہ کہتی ہوئی کہ ہائے بیٹا وقت گزر گیا۔ باپ کا نورانی چہرہ اُس کے سامنے ہے اور اُس میں یہ آواز آتی ہے۔ کہ کیوں بیٹا ہم تمہارے ہی بھلے کے لیے نہکتے تھے۔ بھائی بہن دانتوں میں انگلی دیے ہوئے خاموش ہیں۔ اور اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری ہو۔ دوست آشنا سب غمگین کھڑے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اب ہم کیا کر سکتے ہیں۔

ایسی حالت میں اُس کو اپنی وہ باتیں یاد آتی تھیں جو اُس نے نہایت بے پروائی اور بے مروتی اور کج خلقی سے اپنے ماں باپ۔ بھائی

بہن۔ دوست آشنا۔ کے ساتھ پرتی تھیں۔ ماں کو رنجیدہ رکھنا۔ باپ کو ناراض کرنا۔ بھائی بہن سے بے مروت رہنا۔ دوست آشنا کے ساتھ ہمدردی نہ کرنا یاد آتا تھا۔ اور اُس پر اُن گلی ہڈیوں میں سے ایسی محبت کا دیکھنا اُس کے دل کو پاش پاش کرتا تھا۔ اُس کا دم چھاتی میں گھٹ جاتا تھا اور یہ کم کر چلا اٹھتا تھا کہ ”ہائے وقت نکل گیا ہائے وقت نکل گیا۔ اب کیوں کر اس کا بدلہ ہو گا“

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا۔ اور مکر اتار کر کھڑکی تک پہنچا۔ اور اس کو کھولا اور دیکھا کہ ہوا کچھ ٹھہری ہے۔ اور بجلی کی چمک کچھ تھمی ہے۔ پر رات ویسی ہی اندھیری ہے۔ اس کی گھبراہٹ کچھ کم ہوئی اور پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اتنے میں اس کو اپنا ادھیڑ پنا یاد آیا جس میں نہ وہ جوانی کا جو بن نہ وہ دل رہا تھا اور نہ دل کے ولولوں کا جوش۔ اُس نے اپنی اُس نیکی کے زمانے کو یاد کیا جس میں وہ بہ نسبت بدی کے نیکی کی طرف زیادہ مائل تھا وہ اپنا روزہ رکھنا۔ نمازیں پڑھنی۔ حج کرنا۔ زکوٰۃ دینی۔ بھوکوں کو کھلانا۔ مسجدیں اور کنوئیں بنوانا یاد کر کے اپنے دل کو تسلی دیتا تھا۔ فقیروں اور درویشوں کو جن کی خدمت کی تھی اپنے پیروں کو جن سے بیعت کی تھی اپنی مدد کو پکارتا تھا۔ مگر دل کی بے قرار سی نہیں جاتی تھی۔ وہ دیکھتا تھا کہ اُس کے ذاتی اعمال کا اُسی تک خاتمہ ہے۔ بھوکے پھر ویسے ہی بھوکے ہیں۔ مسجدیں ٹوٹ کر یا تو

کھنڈر ہیں اور پھر ویسے ہی جنگل ہیں۔ کنوئیں اندھے پڑے ہیں۔ نہ پیر اور نہ فقیر کوئی اُس کی آواز نہیں سنتا اور نہ مدد کرتا ہے۔ اُس کا دل پھگھرتا ہے اور سوچتا ہے کہ میں نے کیا کیا جو تمام فانی چیزوں پر دل لگایا۔ یہ پچھلی سچ پہلے ہی کیوں نہ سوچھی اب کچھ بس نہیں چلتا۔ اور پھر یہ کہہ چلا اٹھا ”ہاے وقت ہاے وقت۔ میں نے تجھ کو کیوں کھو دیا“

وہ گہرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا۔ اُس کے پٹ کھولے تو دیکھا کہ آسمان صاف ہے۔ آندھی تھم گئی ہے۔ گھٹا کھل گئی ہے۔ تارے نکل آئے ہیں۔ اُن کی چمک سے اندھیرا بھی کچھ کم ہو گیا ہے وہ دل بہلانے کے لیے تاروں بھری رات کو دیکھ رہا تھا کہ یکایک اُس کو آسمان کے بیچ میں ایک روشنی دکھائی دی اور اس میں ایک خوبصورت دُسن نظر آئی۔ اُس نے ٹکٹکی باندھ کر اُسے دیکھنا شروع کیا۔ جوں جوں وہ اُسے دیکھتا تھا وہ قریب ہوتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اُس کے بہت پاس آگئی۔ وہ اُس کے حسن و جمال کو دیکھ کر حیران ہو گیا۔ اور نہایت پاک دل اور محبت کے لہجہ سے اُس سے پوچھا کہ تم کون ہو۔ وہ بولی کہ میں ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی ہوں۔ اُس نے پوچھا کہ تمہارے تسخیر کا بھی کوئی عمل ہے۔ وہ بولی ہاں ہو۔ نہایت آسان پر بہت مشکل۔ جو کوئی خدا کے فرض اُس بدوی کی طرح جس نے کہا کہ ”واللہ لا ازیل ولا انقص“ (ترجمہ۔ قسم خدا کی نہ برہاؤں گانہ گھٹاؤں گا)

ادا کر انسان کی بھلائی اور اُس کی بہتری میں سعی کرے اس کی میں مسخر ہوں۔ دنیا میں کوئی چیز ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے۔ انسان ہی ایسی چیز ہے جو اخیر تک رہے گا۔ پس جو بھلائی انسان کی بہتری کے لیے کی جاتی ہے وہی نسل در نسل اخیر تک چلی آتی ہے۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ اُسی تک ختم ہو جاتا ہے۔ اُس کی موت اُن سب چیزوں کو ختم کر دیتی ہے۔ مادی چیزیں بھی چند روز میں فنا ہو جاتی ہیں۔ مگر انسان کی بھلائی اخیر تک جاری رہتی ہے۔ میں تمام انسانوں کی روح ہوں۔ جو مجھ کو تسخیر کرنا چاہے انسان کی بھلائی میں کوشش کرے۔ کم سے کم اپنی قوم کی بھلائی میں دل و جان و مال سے سعی ہو۔ یہ کم کر وہ دُلسن غائب ہو گئی اور بُڑھا پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اب پھر اُس نے اپنا پچھلا زمانہ یاد کیا اور دیکھا کہ اُس نے اپنے بچپن برس کی عمر میں کوئی کام بھی انسان کی بھلائی اور کم سے کم اپنی قوم کی بھلائی کا نہیں کیا تھا۔ اُس کے تمام کام ذاتی غرض پر مبنی تھے۔ نیک کام جو کیسے تھے ثواب کے لالچ اور گویا خدا کو رشوت دینے کی نظر سے کیے تھے۔ خاص قومی بھلائی کی خالص نیت سے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

اپنا حال سوچ کر وہ اُس دلفریب دُلسن کے ملنے سے مایوس ہوا۔ اپنا اخیر زمانہ دیکھ کر آئندہ کرنے کی بھی کچھ امید نہ پائی۔ تب تو نہایت مایوسی کی حالت میں بیقرار ہو کر چلا اُٹھا۔ ”ہائے وقت ہائے وقت۔ کیا میں پھر

بچتے بلا سکتا ہوں۔ ہائے میں دس ہزار دیناریں دیتا اگر وقت پھر آتا اور
 میں جوان ہو سکتا۔ یہ کہہ کر اُس نے ایک آہ سرد بھری اور بے ہوش ہو گیا۔
 تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ اُس کے کانوں میں ہٹھکی ہٹھکی باتوں کی آواز
 آنے لگی۔ اُسکی پیاری ماں اُس کے پاس آکھڑی ہوئی۔ اُس کو گلے لگا کر اُس
 کی بیٹی۔ اُس کا باپ اُس کو دکھائی دیا۔ چھوٹے چھوٹے بھائی بہن اُس کے
 گرد آکھڑے ہوئے۔ ماں نے کہا کہ بیٹا کیوں برس کے برس دن روتا ہے۔
 کیوں تو بیقرار ہے کس لیے تیری بچکی بندھ گئی ہے۔ اٹھ منہ ہاتھ دھو کپڑے
 پہن۔ نوروز کی خوشی منا۔ تیرے بھائی بہن منتظر کھڑے ہیں۔ تب وہ لڑکا
 جاگا اور سمجھا کہ میں نے خواب دیکھا اور خواب میں بُدھا ہو گیا تھا۔ اُس نے
 اپنا سارا خواب اپنی ماں سے کہا۔ اُس نے سُنکر اُس کو خواب دیا کہ بیٹا
 بس تو ایسا مت کر جیسا اُس پشیمان بُڈھے نے کیا۔ بلکہ ایسا کر جیسا تیری دُہن
 نے تجھ سے کہا۔

یہ سُنکر وہ لڑکا پلنگ پر سے کود پڑا اور نہایت خوشی سے پکارا
 کہ ”ایہی امیری زندگی کا پہلا دن ہے۔ میں کبھی اُس بُڈھے کی طرح نہ بچتا ہوں گا
 اور ضرور اُس دُہن کو بیاہوں گا جس نے ایسا خوبصورت اپنا چہرہ مجھ کو دکھلایا
 اور ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی اپنا نام بتلایا۔ او خدا او خدا تو میری مدد کر۔
 آمین۔“

پس اے میرے نوجوان ہوطنوں - اور اے میری قوم کے بچو -
اپنی قوم کی بھلائی پر کوشش کرو تاکہ آخر وقت میں اُس بڑھے کی طرح
نہ پچتاؤ۔ ہمارا زمانہ تو اخیر ہے اب خدا سے یہ دعا ہے کہ کوئی نوجوان
اُسٹھے اور اپنی قوم کی بھلائی میں کوشش کرے۔ آمین

(تہذیب الاخلاق)

بحث و تکرار

(ادارہ ذہل ڈاکٹر سید محمد)

جب گئے آپس میں بل کر بیٹھتے ہیں تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک
دوسرے کو بُری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں۔
پھر تھوڑی تھوڑی گویا آواز ان کے نگوںوں سے نکلنے لگتی ہے۔ پھر
تھوڑا سا جڑا کھلتا ہے اور دانت دکھلائی دینے لگتے ہیں اور حلق سے
آواز نکلتی شروع ہوتی ہے۔ پھر باچھیں چڑکڑکانوں سے جا لگتی ہیں
اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے۔ ڈاڑھوں تک دانت
باہر نکل آتے ہیں۔ منہ سے جھاگ نکل پڑتے ہیں اور غیف آواز کے
ساتھ اُسٹھے کھڑے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں۔

اس کا ہاتھ اُس کے گلے میں اور اُس کی ٹانگ اُس کی کمر میں۔ اُس کا کان اُس کے منہ میں اور اس کا ٹینٹو اس کے جبرے میں۔ اس نے اُس کو کاٹا اور اُس نے اس کو پچھاڑ کر بھنھوڑا جو کمزور ہوا دم دبا کر بھاگ نکلا۔

نامنڈب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح پرتکار ہوتی ہے۔ پہلے صاحب سلامت کر کر آپس میں مل بیٹھتے ہیں۔ پھر دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہوتی ہے۔ ایک کوئی بات کہتا ہے دوسرا بولتا ہے واہ یوں نہیں یوں ہے۔ وہ کہتا ہے واہ تم کیا جانو وہ بولتا ہے تم کیا جانو۔ دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے۔ بتوری چڑھ جاتی ہے۔ رخ بدل جاتا ہے۔ آنکھیں ڈراؤنی ہو جاتی ہیں۔ باچھیں چڑھ جاتی ہیں۔ نت نکل پڑتے ہیں۔ تھوک اڑنے لگتا ہے۔ باچھوں تک کف بھراتے ہیں۔ سانس جلدی چلتی ہے۔ رگیں تن جاتی ہیں۔ آنکھ۔ ناک۔ بھوں۔ ہاتھ عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ عین عین آوازیں نکلتی لگتی ہیں۔ آستین چڑھا ہاتھ پھیلا۔ اُس کی گردن اُس کے ہاتھ میں اور اُس کی داڑھی اُس کی مٹھی میں پٹا ڈکی ہوئے لگتی ہے۔ کسی نے بچاؤ کر کر چھڑا دیا تو غراتے ہوئے ایک ادھر چلا گیا اور ایک ادھر۔ اور اگر کوئی بچاؤ کرنے والا نہ ہوا تو کمزور نے پٹ کر کپڑے جھاڑتے سر سے

اپنی راہ لی۔

جس قدر تہذیب میں ترقی ہوتی ہے اُسی قدر اس تکرار میں کمی ہوتی ہے۔ کہیں غرضش ہو کر رہ جاتی ہے۔ کہیں توں تکرار تک نوبت آ جاتی ہے۔ کس آنکھیں بدلنے اور ناک چڑھانے اور جلدی جلدی سانس چلنے ہی پر خیر گزر جاتی ہے۔ مگر ان سب میں کسی کیسی قدر کُتوں کی مجلس کا اثر پایا جاتا ہے۔ پس انسان کو لازم ہے کہ اپنے دوستوں سے کُتوں کی طرح بحث و تکرار کرنے سے پرہیز کرے۔

انسانوں میں اختلاف رائے ضرور ہوتا ہے اور اُس کے پرکھنے کے لیے بحث و مباحثہ ہی کسوٹی ہے۔ اور اگر سچ پوچھو تو نئے مباحثہ اور دل لگی کے آپس میں دوستوں کی مجلس بھی پھیلکی ہے۔ مگر ہمیشہ مباحثہ اور تکرار میں تہذیب و شایستگی محبت اور دوستی کو ہاتھ سے دینا نہ چاہیے۔

پس اے میرے عزیز ہموطنوں۔ جب تم کسی کے برخلاف کوئی بات کہنی چاہو یا کسی کی بات کی تردید کا ارادہ کرو تو خوش اخلاقی اور تہذیب کو ہاتھ سے مت دو۔ اگر ایک ہی مجلس میں دو بدو بات چیت کرتے ہو تو اور بھی نرمی اختیار کرو۔ چہرہ۔ لہجہ۔ آواز۔ وضع۔ لفظ اس طرح رکھو جس سے تہذیب اور شرافت ظاہر ہو۔ مگر بناوٹ بھی نہ پائی جاو۔

نزید ہی گفتگو کے ساتھ ہمیشہ سادگی سے معذرت کے الفاظ استعمال کرو۔ مثلاً یہ کہ میری سمجھ میں نہیں آیا یا شاید مجھے دھوکہ ہوا۔ یا میں غلط سمجھا گو بات تو عجیب ہے مگر آپ کے فرمانے سے باور کرتا ہوں۔ جب دو تین دفعہ بات کا الٹ پھیر ہوا اور کوئی اپنی رائے کو نہ بدسے تو زیادہ تکرار مست بڑھاؤ۔ یہ کہہ کر کہ میں اس بات کو پھر سوچوں گا یا اس پر پھر غور کروں گا۔ جھگڑے کو مہنسی خوشی دوستی کی باتیں کہہ ختم کرو۔ دوستی کی باتوں میں اپنے دوست کو یقین دلاؤ کہ اُس دو تین دفعہ کے الٹ پھیر سے تمہارے دل میں کچھ کدورت نہیں آئی ہے اور نہ تمہارا مطلب باتوں کے اُس الٹ پھیر سے اپنے دوست کو کچھ تکلیف دینے کا تھا کیونکہ جھگڑا یا شبہ زیادہ دنوں تک رہنے سے دونوں کی محبت میں کمی ہو جاتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ دوستی ٹوٹ جاتی ہے اور ایسی عزیز چیز (جیسے کہ دوستی) ہاتھ سے جاتی رہتی ہے۔

جبکہ تم مجلس میں ہو جہاں مختلف رائے کے آدمی ملے ہوئے ہیں تو جہاں تک ممکن ہو جھگڑے اور تکرار اور مباحثہ کو آنے مت دو کیونکہ جب تقریر بڑھ جاتی ہے تو دونوں کو ناراض کر دیتی ہے جب دیکھو کہ تقریر یلینی ہوئی تھی جاتی ہے اور تیزی اور زور سے تقریر ہونے لگی ہے تو

جس قدر جلد ممکن ہو اُس کو ختم کرو۔ اور آپس میں ہنسی خوشی مذاق کی باتوں سے دل کو ٹھنڈا کر لو۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے ہموطن اس بات پر غور کریں کہ اُن کی مجلسوں میں آپس کے مباحثہ اور تکرار کا انجام کیا ہوتا ہے۔

خوشامد

(از آنرہیل ڈاکٹر سید مرحوم)

دل کی جس قدر بیماریاں ہیں اُن میں سب سے زیادہ مہلک خوشامد کا بھاگ لگنا ہے۔ جس وقت کہ انسان کے بدن میں ایسا مادہ پیدا ہو جاتا ہے جو دماغی ہوا کے اثر کو جلد قبول کر لیتا ہے تو اُسی وقت انسان مرض مہلک میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جبکہ خوشامد کے اچھا لگنے کی بیماری انسان کو لگ جاتی ہے تو اُس کے دل میں ایک ایسا مادہ پیدا ہو جاتا ہے جو ہمیشہ زہریلی باتوں کے زہر کو چوس لینے کی خواہش رکھتا ہے۔ جس طرح کہ خوش گلو گانے والے کا راگ اور خوش آئند بابے کی آواز انسان کے دل کو نرم کر دیتی ہے۔ اسی طرح خوشامد بھی انسان کے دل کو پھیلا دیتی ہے کہ ہر ایک کانٹے کے جھننے کی جگہ اُس میں ہو جاتی ہے۔

اول اول یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنی آپ خوشامد کرتے ہیں اور اپنی

ہر ایک چیز کو اچھا سمجھتے ہیں۔ اور آپ ہی آپ اپنی خوشامد کر کے اپنے دل کو خوش کرتے ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ اوروں کی خوشامد ہم میں اثر کرنے لگتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اول تو خود ہم کو اپنی محبت پیدا ہوتی ہے پھر یہی محبت ہم سے باغی ہو جاتی ہے۔ اور ہمارے بیرونی دشمنوں سے جا ملتی ہے۔ اور جو محبت و مہربانی ہم خود اپنے ساتھ کرتے تھے وہ ہم خوشامد لوگوں کے ساتھ کرنے لگتے ہیں۔ اور وہی ہماری محبت ہم کو یہ بتلاتی ہے کہ اُن خوشامدیوں پر مہربانی کرنا نہایت حق اور انصاف ہے۔ جو ہماری باتوں کو ایسا سمجھتے ہیں اور اُن کی اس قدر کرتے ہیں جبکہ ہمارا دل ایسا نرم ہو جاتا ہے اور اس قسم کے پُھسلاوے اور فریب میں آ جاتا ہے تو ہماری عقل خوشامد لوگوں کے مکر و فریب سے اندھی ہو جاتی ہے۔ اور وہ مکر و فریب ہماری بیماری طبیعت پر غالب آ جاتا ہے۔

لیکن اگر ہر شخص کو یہ بات معلوم ہو جاوے کہ خوشامد کا شوق کیسے نالایق اور کمینہ سببوں سے پیدا ہوتا ہے تو یقینی خوشامد کی خواہش کرنے والا شخص بھی ویسا ہی نالایق اور کمینہ متصور ہونے لگے گا۔ جبکہ ہم کو کسی ایسے وصف کا شوق پیدا ہوتا ہے جو ہم میں نہیں ہے یا ہم ایسے بننا چاہتے ہیں جیسے کہ درحقیقت ہم نہیں ہیں۔ تب ہم اپنے تئیں خوشامدیوں کے حوالے کرتے ہیں جو اوروں کے اوصاف اور اوروں کی

خوبیاں ہم میں لگانے لگتے ہیں۔ گو بسبب اُس کینہ شوق کے اُن خوشامدی کی باتیں ہم کو اچھی لگتی ہوں۔ مگر درحقیقت وہ ہم کو ایسے ہی بدزیب ہیں جیسے کہ دوسروں کے کپڑے جو ہمارے بدن پر کسی طرح ٹھیکسا نہیں۔ اس بات سے کہ ہم اپنی حقیقت کو چھوڑ کر دوسرے کے اوصاف اپنے میں سمجھنے لگیں۔ یہ بات نہایت عمدہ ہے کہ ہم خود اپنی حقیقت کو درست کریں اور سچ مچ وہ اوصاف خود اپنے میں پیدا کریں اور بعض جھوٹی نقل بننے کے خود ایک اچھی اصل ہو جاویں۔ کیونکہ ہر قسم کی طبیعتیں جو انسان رکھتے ہیں اپنے اپنے موقع پر مفید ہو سکتی ہیں۔ ایک تیز مزاج اور جست چالاک آدمی اپنے موقع پر ایسا ہی مفید ہوتا ہے۔ جیسے کہ ایک رونی صورت کا چُپ چاپ آدمی اپنے موقع پر۔

خودی جو انسان کو برباد کرنے والی چیز ہے جب چُپ چاپ سوئی ہوئی ہوتی ہے تو خوشامدی کو جگاتی اور اُبھارتی ہے۔ اُس میں چھمکورے پن کی کافی لیاقت پیدا کر دیتی ہے۔ مگر یہ بات بخوبی یاد رکھنی چاہیے کہ جس طرح خوشامد ایک بدتر چیز ہے اسی طرح مناسب اور سچی تعریف کرنا نہایت عمدہ اور بہت ہی خوب چیز ہے۔ جس طرح کہ لائق شاعر دوسروں کی تعریف کرتے ہیں کہ اُن اشعار سے اُن لوگوں کا نام باقی رہتا ہے دونوں شخص خوش ہوتے ہیں۔ ایک اپنی لیاقت کی وجہ سے

اور دوسرا اُس لیاقت کو تیز کرنے کے سبب سے۔ مگر لیاقت شاعری کی یہ ہر کہ وہ نہایت بڑے استقامت و مصور کے مانند ہو کہ اصل صورت اور رنگ اور خال خط کو بھی قایم رکھتا ہے۔ اور پھر بھی تصویر ایسی بناتا ہے کہ خوش نما معلوم ہو۔

ایشیا کے شاعروں میں ایک بڑا نقص یہی ہے کہ وہ اس بات کا خیال نہیں رکھتے بلکہ جس کی تعریف کرتے ہیں اُس کے اوصاف ایسے جھوٹے اور ناممکن بیان کرتے ہیں جن کے سبب سے وہ تعریف تعریف نہیں رہتی بلکہ فرضی خیالات ہو جاتے ہیں۔

ناموری کی مثال نہایت عمدہ خوشبو کی ہے۔ جب ہوشیاری اور سچائی سے ہماری واجب تعریف ہوتی ہے تو اُس کا ویسا ہی اثر ہوتا ہے جیسے عمدہ خوشبو کا مگر جب کسی کمزور دماغ میں زبردستی سے وہ خوشبو ٹھونس دی جاتی ہے تو ایک تیز بو کی مانند دماغ کو پریشان کر دیتی ہے۔ فیاض آدمی کو بدنامی اور نیک نامی کا زیادہ خیال ہوتا ہے اور عالی ہمت طبیعت کو مناسب عزت اور تعریف سے ایسی ہی تقویت ہوتی ہے جیسے کہ غفلت اور حقارت سے پست ہمتی ہوتی ہے۔ جو لوگ کہ عوام کے درجہ سے اوپر ہیں انھیں لوگوں پر اس کا زیادہ اثر ہوتا ہے جیسے کہ محرم میٹر میں وہی حصہ موسم کا زیادہ اثر قبول کرتا ہے جو صاف

اور سب سے اوپر ہوتا ہے۔ (تہذیب الاخلاق)

تعصّب

(از ڈاکٹر سر سید مہموم)

انسان کی بدترین خصلتوں میں سے تعصّب بھی اک بدترین خصلت ہے۔ یہ ایسی بخلت ہے کہ انسان کی تمام نیکیوں اور اُس کی تمام خوبیوں کو غارت اور برباد کرتی ہے۔ متعصّب گو اپنی زبان سے نہ کہے۔ مگر اُس کا طریقہ یہ بات جھٹلاتا ہے کہ عدل و انصاف کی خصلت جو عمدہ ترین خصائل انسانی سے جو اُس میں نہیں ہے۔ متعصّب اگر کسی غلطی میں پڑتا ہے تو اپنے تعصّب کے سبب اُس غلطی سے نکل نہیں سکتا۔ کیونکہ اُس کا تعصّب اس کے برخلاف بات کے سننے اور سمجھنے اور اُس پر غور کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اور اگر وہ کسی غلطی میں نہیں ہے بلکہ سچی اور سیدھی راہ پر ہے تو اُس کے فائدے اور نیکی کو پھیلنے اور عام ہونے نہیں دیتا۔ کیونکہ اُس کے مخالفوں کو اپنی غلطی پر متنبہ ہونے کا موقعہ نہیں ملتا۔

تعصّب انسان کو ہر طرح کی نیکیوں کے حاصل کرنے سے باز رکھتا ہے اکثر دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی کام کو نہایت عمدہ

اور مفید سمجھتا ہے مگر صرف تعصب سے اُس کو اختیار نہیں کرتا۔ اور دیدہ و دانستہ بُرائی میں گرفتار اور بھلائی سے بیزار رہتا ہے۔

مذہبی تعصبات کی نسبت بھی ہم کچھ تھوڑا سا بیان کریں گے۔ مگر اول امور تمدن و معاشرت میں جو نقصان تعصب سے پیدا ہوتے ہیں اُن کا ذکر کرتے ہیں۔

انسان قواعد قدرت کے مطابق مدنی الطبع پیدا ہوا ہے۔ وہ تنہا اپنی حوائج ضروری کو مہیا نہیں کر سکتا۔ اس کو ہمیشہ مددگاروں اور معاونوں کی جو دوستی و محبت سے ہاتھ آتے ہیں ضرورت ہوتی ہے۔ مگر تعصب بسبب اپنے تعصب کے تمام لوگوں سے نفرت اور بیزار رہتا ہے۔ اور کسی کی دوستی و محبت کی طرف بجز اُن چند لوگوں کے جو اُس کے ہم راسے ہیں مائل نہیں ہوتا۔

عقل اور قواعد قدرت کا متقصد نایہ معلوم ہوتا ہے کہ امور متعلق تمدن و معاشرت میں جو باتیں زیادہ آرام اور زیادہ لیاقت اور زیادہ عزت کی ہیں اُن کو انسان اختیار کرے مگر تعصب اُن سب نعمتوں سے محروم رہتا ہے۔

ہنر اور فن اور علم ایسی عمدہ چیزیں ہیں کہ ان میں سے ہر ایک چیز کو نہایت اعلیٰ درجہ تک حاصل کرنا چاہیے۔ مگر تعصب اپنی خصلت

سے ہر ایک ہنر اور فن اور علم کے اعلیٰ درجہ تک پہنچنے سے محروم رہتا ہے۔

وہ اُن تمام دلچسپ اور مفید باتوں سے جو نئی تحقیقات سے اور نئے علوم اور فنون سے حاصل ہوتی ہیں محض جاہل اور نادان واقف رہتا ہے اُس کی عقل اور اُس کے دماغ کی قوت محض بیکار ہو جاتی ہے۔ اور جو کچھ اُس میں سمائی ہوئی ہے اُس کے سوا اور کسی بات کے سمجھنے کی اُس میں طاقت اور قوت نہیں رہتی وہ ایک ایسے جانور کے مانند ہو جاتا ہے کہ اُس کو جو کچھ بالطبع آتا ہے اُس کے سوا اور کسی چیز کی تعلیم و تربیت کے قابل نہیں ہوتا۔

بہت سی قومیں ہیں جو اپنے تعصب کے باعث سے تمام باتوں میں کیا اخلاق میں اور کیا علم و ہنر میں اور کیا فضل و دانش میں اور کیا تہذیب و شائستگی میں اور کیا جاہ و شہرت اور مال و دولت میں اعلیٰ درجہ سے نہایت پست درجہ مذلت اور خواری کو پہنچ گئی ہیں۔ اور بہت سی قومیں ہیں جنہوں نے اپنی بے تعصبی سے ہر جگہ اور ہر قوم سے اچھی اچھی باتیں اخذ کیں اور اپنے درجہ سے ترقی کے اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ پر پہنچ گئیں۔ مجھ کو اپنے ملک کے بھائیوں پر اس بات کی بدگمانی ہے کہ وہ بھی تعصب کی بدفصلت میں گرفتار ہیں اور اس سبب سے ہزاروں

قسم کی بھلائیوں کے حاصل کرنے سے اور دنیا میں اپنے تئیں ایک معزز قوم کو دکھانے سے محروم اور ذلت اور خواری اور بے علمی اور بے ہنری کی مصیبت میں گرفتار ہیں۔ اور اسی لیے میری خواہش ہے کہ وہ اس بدخصلت سے نکلیں اور علم و فضل اور ہنر و کمال کے اعلیٰ درجہ کی عزت تک پہنچیں۔

ہم مسلمانوں میں ایک غلطی یہ پڑی ہے کہ بعضی دفعہ ایک غلط فہمی کے جذبہ سے تعصب کو اچھا سمجھتے ہیں۔ اور جو شخص اپنے مذہب میں بڑا متعصب ہو اور تمام شخصوں کو جو اُس کے مذہب کے نہیں ہیں۔ اور تمام اُن علوم و فنون کو جو اُس مذہب کے لوگوں میں نہیں ہیں نہایت حقارت سے دیکھے اور بُرا سمجھے۔ اُس شخص کو نہایت قابلِ تعریف اور توصیف کے اور بڑا پختہ اور پکا اپنے مذہب میں سمجھتے ہیں۔ مگر ایسا سمجھنا سب سے بڑی غلطی ہے۔ جس نے حقیقت میں مسلمانوں کو برباد کر دیا ہے۔

ہمارا مذہب اور مذہبی علوم اور دنیا اور دنیاوی علوم بالکل علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ پس بڑی نادانی ہے جو دنیاوی علوم اور فنون کے سیکھنے میں کسی قسم کے تعصب مذہبی کو کام میں لاویں۔

اگر یہ خیال ہو کہ اُن دنیاوی علوم کے سیکھنے سے ہمارے عقائد مذہبی میں سُستی آتی ہے کیونکہ مذہبی مسائل اُن دنیاوی علوم کے پڑھنے سے

مشتبہ یا غلط معلوم ہوتے ہیں تو نہایت ہی افسوس کا مقام ہو کہ مسلمان اپنے ایسے روشن اور مستحکم سچے مذہب کو ایسا ضعیف اور کمزور سمجھتے ہیں کہ دنیاوی علوم کی ترقی سے اُس کی برہمی کا خیال کرتے ہیں۔ لغو ذہن باللہ منہا۔ مذہب اسلام ایسا مستحکم اور سچا مذہب ہو کہ جس قدر دینی اور دنیاوی علوم کی ترقی ہوتی جاوے گی۔ اُسی قدر اُس کی سچائی زیادہ تر ثابت ہوگی۔

اب ہم یہ بات بتاتے ہیں کہ اپنے مذہب میں پختہ ہونا بد بات ہو اور یہ ایک نہایت عمدہ صفت ہو۔ جو کسی اہل مذہب کے لیے ہو سکتی ہو اور تعصب گو کہ وہ مذہبی باتوں میں کیوں نہ نہایت بُرا اور خود مذہب کو نقصان پہنچانے والا ہو۔

غیر متعصب مگر اپنے مذہب میں پختہ ہمیشہ سچا دانا دوست اپنے مذہب کا ہوتا ہے۔ اُس کی خوبیوں اور نیکیوں کو چھپلاتا ہے۔ اُس کے اصولوں کو دلائل و براہین سے ثابت کرتا ہے۔ مخالفوں اور معتبر عقول اور بُرا کہنے والوں کی باتوں کو ٹھنڈے دل سے سُنتا ہو اور خود بھی اُس کے دفعیہ پرست نہ ہوتا ہے اور اور لوگوں کو بھی اُس کے دفعیہ کا موقع دیتا ہے۔

برخلاف اس کے متعصب نادان دوست اپنے مذہب کا

ہوتا ہے۔ وہ سراسر اپنی نادانی سے اپنے مذہب کو نقصان پہنچاتا ہے۔ پہلی بسم اللہ ایسی بدخصلت اختیار کرنے سے جو ہر عقلمند کے نزدیک نفرت کے قابل ہے۔ اپنے مذہب کے حسن اخلاق اور اُس کے نتیجوں کی خوبی پر داغ لگاتا ہے۔ اپنے مذہب کی خوبیوں کے پھیلنے اور لوگوں کو اُس کے طرف راغب کرنے کے بدلے اُلٹا اُس کا ہار ج قوی ہوتا ہے۔ اپنے تعصب کے سبب بد اخلاق اور مغرور اور منقشف سخت دل ہو جاتا ہے اور ٹھیک ٹھیک اس آیت کریمہ **لَوْ كُنْتَ فَظًا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَا لَفَضْتُ مِنْ حَوْلِكَ** سے مخالفت صریح کرتا ہے۔

مذہب میں متعصب شخص دوسروں کے اعتراضوں کو جو اس کے مذہب پر ہیں سننا یا مشہور ہونا پسند نہیں کرتا۔ اور اس سبب سے غمناک وہ اس بات کا باعث ہوتا ہے کہ مخالفوں کے اعتراض بلا تحقیقات کیے اور بلا جواب دیے باقی رہ جائیں، وہ اپنی نادانی سے تمام دنیا پر گویا یہ بات ظاہر کرتا ہے کہ اس کے مذہب کو مخالفوں کے اعتراضوں سے نہایت اندیشہ اور اس کے برہم ہو جانے کا خوف ہے۔ پس یہ متسام بائیں مذہب کی رستی کی نہیں ہیں۔ بلکہ مخالفوں کی فتح بائیں اور میدان جیت لینے کی ہیں۔

غرض کہ تعصب خواہ دینی باتوں میں ہو یا دنیاوی باتوں میں۔

نہایت بُرا اور بہت سی خرابیوں کا پیدا کرنے والا ہے۔
مغرور و متکبر ہو جانا اور اپنے ہم جنسوں کو سوائے چند کے نہایت
حقیر و ذلیل سمجھنا متعصب کا خاصہ ہوتا ہے۔

اُس کے اصولوں کا مقتضایہ ہوتا ہے کہ تمام دنیا کے لوگوں سے
سوائے چند کے کنارہ گرین ہو مگر ایسا کر نہیں سکتا۔ اور مجبوری ہر ایک
سے ملتا ہے اور اوپر سے دل سے اُن کا ادب اور اپنی جھوٹی نیاز مندی
بھی ظاہر کرتا ہے۔ اور ایسا کرنے سے ایک بے خصلت نفاق اور کذب
اور غابازی اور فریب و مکاری کی اپنے میں پیدا کرتا ہے۔

دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس نے خود ہی تمام کمالات اور
تمام خوبیاں اور خوشیاں حاصل کی ہوں۔ بلکہ ہمیشہ ایک قوم نے دوسری
قوم سے فائدہ اٹھایا ہے مگر متعصب شخص ان نعمتوں سے بد نصیب رہتا
ہے۔

علم میں اُس کو ترقی نہیں ہوتی۔ ہنر و فن میں اُس کو دستگاہ نہیں
ہوتی۔ دنیا کے حالات سے وہ ناواقف رہتا ہے۔ عجائبات قدرت کے
دیکھنے سے محروم ہوتا ہے۔ حصول معاش اور دنیاوی عزت اور تمدن
مثل تجارت وغیرہ کے وسیلے جاتے رہتے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ تمام
دنیا کے انسانوں میں روز بروز ذلیل و خوار اور حقیر و ناچیز ہوتا جاتا ہے۔

اُس کی مثال ایک ایسے جانور کی ہوتی ہے جو اپنے ریڑھ میں مار رہتا ہے اور نہیں جانتا کہ اُس کے اور ہم جنس کیا کر رہے ہیں۔ بیل کیا چھپاتی ہے اور قمری کیا غل چھپاتی ہے۔ بیا کیا بن رہا ہے اور کئی کیا چن رہی ہے۔ وہ بجز کوڑے پر کی گھاس کے چرنے کے اور کچھ نہیں جانتا کہ باغ کیوں بنا ہے اور پھول کیوں کھلا ہے۔ زنگس کیا دیکھتی ہے۔ اور انگور کی تاک کیا تاکتی ہے۔

تعصب میں سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ جب تک وہ نہیں جانتا کوئی ہنر و کمال اُس میں نہیں آتا۔ تربیت اور شایستگی۔ تہذیب و انسانیت کا مطلق نشان نہیں پایا جاتا۔ اور جبکہ وہ مذہبی غلط ٹائپنگی کے پردے میں ظہور کرتا ہے تو اور بھی سَم قاتل ہوتا ہے۔ کیونکہ مذہب سے اور تعصب سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ انسان کی خراب و برباد کرنے کے لیے شیطان کا سب سے بڑا دواؤں تعصب کو مذہبی رنگت سے دل میں ڈالنا اور اس تاریکی کے فرشتہ کو روشنی کا فرشتہ کر کر دکھلانا ہے۔

پس میری التجا اپنے بھائیوں سے یہ ہے کہ ہمارا خدا نہایت مہربان اور بہت بڑا منصف ہے اور سچا سچائی کا پسند کرنے والا ہے۔ وہ ہمارے دلوں کے بھید جانتا ہے۔ وہ ہماری نیتوں کو چھانتا ہے۔ پس ہم کو

اپنے مذہب میں نہایت سچائی سے پختہ رہنا مگر تعصب کو جو ایک بُری
 خصلت ہے چھوڑنا چاہیے۔ تمام بنی نوع انسان ہمارے بھائی ہیں۔
 ہم کو سب سے محبت اور سچا معاملہ رکھنا اور سب سے سچی دوستی اور
 سب کی سچی چیز خواہی کرنا ہمارا قدرتی فرض ہے۔ پس اسی کی ہم کو
 پیروی چاہیے۔

”شہنشاہِ اکبر“

(از پروفیسر محمد حسین آزاد دہلوی)

جن دنوں ہمایوں شیرشاہ کے ہاتھ سے پریشان حال تھا۔ ایک
 دن ماں نے اُس کی ضیافت کی۔ وہاں ایک نوجوان لڑکی نظر آئی۔ او
 دیکھتے ہی اُس کے حُسن و جمال کا عاشق شیدہ ہو گیا۔ دریافت کیا تو
 لوگوں نے عرض کیا کہ حمیدہ بانو بیگم اُس کا نام ہے۔ ایک سید بزرگوار
 شیخ زندہ پیل احمد جام کی اولاد میں ہیں۔ اور آپ کے بھائی مرزا
 ہندال کے استاد ہیں۔ یہ اُن کے خاندان کی بیٹی ہے۔ ہمایوں نے
 چاہا کہ اُسے عقد میں لائے۔ ہندال نے کہا مناسب نہیں۔ ایسا نہو کہ
 میرے استاد کو ناگوار ہو۔ ہمایوں کا دل ایسا نہ تھا کہ کسی کے سمجھائے

سمجھ جاتا۔ آخر محل میں داخل کر لیا۔

لیکن حضرت عشق نے شادی کی تھی۔ اور محبت کے قاضی نے
 نکاح پڑھا تھا۔ ہمایوں کو دم بھر جُدائی گوارا نہ تھی۔ دن ایسے نحوست کے
 تھے کہ ایک جگہ قرار نہ ملتا تھا۔ ابھی پنجاب میں ہی۔ ابھی سندھ میں ہی۔
 ابھی بیکانیر میں میر کے ریگستان میں سرگرداں چلا جاتا ہے۔ پانی دھو بیٹھنا
 ہے تو منزلوں تک میسر نہیں۔ جو دھپور کا رخ ہو کہ ادھر سے امید کی
 آواز آئی ہے۔ قریب پہنچ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ امید نہ تھی۔ دعا آواز
 بدل کر بول رہی تھی۔ وہاں تو موت منہ کھولے بیٹھی ہے۔ ناچار پھر لٹے پاؤں
 پھر آتا ہے۔ یہ سب مصیبتیں ہیں۔ مگر پیاری بی بی دم کے ساتھ ہی۔
 کئی لڑائی کے مقاموں میں اس کے سبب سے خطرناک خرابیاں اٹھانی
 پڑیں۔ مگر اُسے تعویذ کی طرح گلے سے لگائے پھرا۔ جب وہ جو دھپور کے سفر
 میں تھے تو اکبر ماں کے پیٹ بآپ کے رنج و راحت کا شریک تھا۔ اس
 سفر سے پھرے اور سندھ کی طرف آئے۔ ایام ولادت بہت نزدیک
 تھے۔ اس لیے بیگم کو امرکوٹ میں چھوڑا اور آپ آگے پُرانی لڑائی کو تازہ
 کیا۔ اسی عالم میں ایک دن ملازم نے آکر خبر دی کہ مبارک۔ اقبال کا تارا
 طلوع ہوا۔ یہ ستارہ ایسے ادبار کے وقت چھلایا تھا کہ کسی کی آنکھ ادھر نہ اٹھی
 مگر تقدیر ضرور کستی ہوگی کہ دیکھنا! آفتاب ہو کر چلے گا۔ اور سارے ستارے

اس کی روشنی میں دُھندلے ہو کر نظروں سے غایب ہو جائیں گے۔

ترکوں میں رستم ہو کہ جب کوئی خوش خبری لاتا ہے تو اُسے کچھ دیتے ہیں۔ ایک سفید پوش اشراف ہو گا تو اپنا چنہ ہی اُتار کر دیدے گا۔ امیر ہے تو اپنی دستگاہ کے بموجب خلعت اور گھوڑا۔ نقد و جنس جو جو کچھ ہو سکے گا دیگا۔ سب کی دنیا فیتس کرے گا۔ نوکروں کو انعام اکرام سے خوش کرے گا۔ ہمایوں کے پاس جب سواریہ جنرل لایا تو اُس کی حالت ایسی ہو رہی تھی کہ دائیں بائیں دیکھا۔ کچھ نہ پایا۔ آخر یاد آیا کہ کمر میں ایک مشک نافہ ہے۔ اُسے نکال کر توڑا۔ اور ذرا سا مشک سب کو دیدیا کہ شگون خالی نہ جائے۔ اللہ اللہ۔ تقدیر نے کہا ہو گا کہ دل میلا نہ کیجیو۔ اس بچے کی شمیم اقبال مشک کی طرح تمام علم میں پھیلے گی۔ بے سامان بچے کو جس طرح خدا نے تمام سامان ملک و دولت کے دیے اُسی طرح ولادت کے وقت ستاروں کو بھی اس نظام کے ساتھ ہر اک بُرج میں واقع کیا کہ آج تک نجومی حیران ہوتے ہیں۔ ہمایوں خود ہیست اور نجوم کا ماہر تھا۔ اور اُس کے زائچے کو اکثر دیکھا کرتا تھا اور کہتا تھا کہ کئی باتوں میں امیر تیمور سے بھی زیادہ مبارک ہے۔

اکبر ابھی حل میں تھا۔ اور میر شمس الدین محمد کی بی بی بھی حاملہ تھیں۔ بیگم نے اُن سے وعدہ کیا تھا کہ میرے یہاں بچہ ہو گا۔ تو تھا رادودھ

اُسے دوں گی۔ اتفاق یہ کہ جب اکبر پیدا ہوا تو اُن کے یہاں ابھی کچھ نہ ہوا تھا۔ بیگم نے پہلے آپ دودھ پلایا پھر اُن کے دودھ نہ رہا تو بعض بعض اور بی بیاں بھی دودھ پلاتی رہیں۔ چند روز کے بعد جب اُن کے یہاں بچہ ہوا تو اُنہوں نے دودھ پلایا اور زیادہ نرا انھیں کا دودھ پیا۔ یہی سبب ہو کہ اکبر انھیں جچی کہا کرتا تھا۔

ہمایوں سندھ کے ملک میں مدت تک لڑتا پھرتا رہا کہ شاید شہت یاوری کرے اور ایسی صورت بن جائے کہ پھر ہندوستان پر فوج کشی کرنے کا سامان ہم پہنچ جائے۔ لیکن نہ تدبیر چلی نہ شمشیر آخر ملک سندھ سے ڈیرے اٹھائے۔ خیال ہوا کہ فی الحال بولان کی گھاٹی سے نکل کر قندھار کو دیکھنا چاہیے کہ قریب ہی وہاں سے مشہد کا راستہ بھی روشن ہے۔ بلخ و بخارا کی راہ بھی جاری ہے۔ عسکری مرزا اس وقت قندھار میں حکومت کر رہا ہے۔ میں اس قدر حادثے اٹھا کر آیا ہوں۔

عیال کا ساتھ ہی آخر بھائی ہے۔ جتنا خون کب تک ٹھنڈا رہے گا۔ کچھ بھی حق نہ سمجھا تو مہمانی ترک نہ کہیں نہیں گئی۔ چند روز رکھ کر اُس کا اور نکاح اراک قدیم کا رنگ دیکھوں گا۔ بوئے وفانہ پاؤں کا توجہ ہر منہ اٹھے گا چلا جاؤں گا۔ کہ خلق خدا الملک خدا۔

اسی عالم میں شمال کے قریب پہنچا۔ مرزا عسکری کو بھی خبر پہنچ گئی

تھی۔ رفیقوں کو لے کر چلا کہ بے خبر پہنچ کر ہمایوں کو شدید کر لے۔ موقع نہ پائے
 تو کہے کہ استقبال کو آیا ہوں۔ غرض نور کا ترک کا تھا کہ سوار ہوا اور پوچھا
 کہ ادھر واسن کیوہ کا رستہ کون جانتا ہے۔ چے بہادر ایک اذبک پہلے
 ہمایوں کے وفاداروں کا نوکر تھا۔ تنہا ہی کے عالم میں مرزا عسکری کے
 پاس نوکری کر لی تھی۔ اُس وقت نمک کی تاثیر چپک اٹھی۔ اور ہمایوں
 کی حالت نے اُس کے دل میں غائبانہ رحم پیدا کیا۔ اُس نے عرض کی۔
 میں جانتا ہوں اور کئی دفعہ آیا گیا ہوں۔ مرزا نے کہا سچ کہتا ہے۔ ادھر
 اس کی جاگیر تھی۔ اچھا آگے آگے چل۔ اُس نے کہا میرا بوکام نہیں کرتا۔
 مرزا نے ایک نوکر سے گھوڑا دلوا دیا۔ چے بہادر نے تھوڑی دور آگے
 چل کر گھوڑا اڑایا۔ اور سید حایرم خاں کے خیمے میں آیا۔ کان میں کہا
 کہ مرزا آن پہنچا ہے۔ اب فرصت کا وقت نہیں۔ اور میں قدرتی اتفاق سے
 اس طرح پہنچا ہوں۔ بیرم خاں اُسی وقت چپ چاپ اٹھ کر خیمے کے پیچھے
 سے ہمایوں کے پاس آیا اور حال بیان کیا۔ سو اس کے اور کیا ہو سکتا تھا
 کہ ایران کا ارادہ مہم کریں۔ تردی بیگ کے پاس آدمی بھیجا کہ چند گھوڑے
 بھیج دو۔ اس نا اہل نے مروت نے صاف جواب دیا۔ ہمایوں کو خدا
 یاد آیا کہ بھائیوں کا یہ حال۔ نمک خواروں اور ہمارا ہیوں کا یہ حال۔
 جو دھپور کے ریتے کی بے وفائی اور بے حیائی بھی یاد آگئی۔ چاہا کہ اس وقت

خود جائے اور اُس کو حد کو پہنچائے۔ پیرم خاں نے عرض کی کہ وقت تنگ ہے۔ بات کی بھی گنجائش نہیں۔ آپ اُن کافر لغتوں کو تو رات ہی کے حوالہ کریں۔ اور جلد سوار ہوں۔ اکبر اُس وقت پورا برس دن کا بھی نہیں ہوا تھا۔ اسے میر غزنوی اور خواجہ سرا وغیرہ اور ماہم اٹک کے سپرد کر کے یہیں چھوڑا۔ بیگم توجان کے ساتھ تھیں۔ وفاداروں سے کہا کہ مرزا کا خدا نگہبان ہے۔ ہم آگے چلتے ہیں۔ بیگم کو کسی طرح تم ہم تک پہنچا دو۔ آپ مخلصان جاں نثار کے ساتھ دشت غزوت کو روانہ ہوا۔ پیچھے بیگم بھی آئیں۔

اب اُدھر کی سنو۔ کہ مرزا عسکری جب پہنچا تو بے وارثے قافلے کو دیکھ کر بہت اپنی بدینتی پر بھٹپٹا یا۔ تزدی بیگ سب کو لیکر حاضر ہوئے۔ مگر سب میں یہ بھی نظر بند ہو گئے۔ میر غزنوی سے پوچھا کہ مرزا (اکبر) کہاں ہیں۔ عرض کی گھر میں ہیں۔ چچا نے ایک اونٹ میوے کا بیٹھے کے لیے بھیجا اور ڈیوڑھی پر آیا کہ بیٹھے سے ملوں گا۔ یہاں رات قیامت کی رات گزری تھی۔ سب کے دل دھکڑو دھکڑا کر تھے کہ ماں باپ اُس حال سے گئے۔ ہم ان پہاڑوں میں بے سرو سامان پڑے ہیں۔ بے مروت چچا ہے۔ اور معصوم بچے کی جان ہی اللہ ہی نگہبان ہے۔ میر غزنوی اور ماہم اٹک اکبر کو کندھے سے لگائے سامنے آئی۔ منافق چچا نے گود میں لے لیا۔ اور زہر خند ہنسی سے بول چال کر چاہا کہ بچہ ہنسے بولے۔ مگر اکبر کے لبوں پر تبسم بھی نہ آیا۔

چھپکا منہ دیکھا کیا۔ مرزا عسکری کے گلے میں ایک انگوٹھی سرخ ریشم کے ڈورے میں تھی۔ لال لچھا باہر نظر آتا تھا۔ اکبر نے اُس پر ہاتھ بڑھایا۔ بارے چھپانے اپنے گلے سے اتار کر بھیتجے کے گلے میں ڈال دی۔ دل شکستہ ہوا خواہوں نے کہا۔ کیا عجب ہو کہ خدا ایک دن اسی طرح سلطنت کی انگوٹھی اس نو نمل کی انگلی میں پہنا دے۔

غرض مرزا عسکری اکبر کو اپنے ساتھ قندھار لے گیا۔ قلعہ کے اندر ایک بالا خانہ رہنے کو دیا۔ اور سلطان بیگم اپنی بی بی کے سپرد کیا۔ بیگم بڑی محبت و شفقت سے پیش آتی تھی خدا کی شان دیکھو۔ باپ کے بانی دشمن۔ بیٹے کے حق میں ماں باپ ہو گئے۔ ماہم اور بیچی اندر۔ میر غزنوی باہر خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ یا عنبر خواجہ سرائی تھا کہ اکبری اقبال کے دور میں اعتماد خاں ہو کر بڑا صاحب اختیار ہوا۔

ترکوں میں رسم ہے کہ بچہ جب پانچ چلنے لگتا ہے تو باپ دادا چچا وغیرہ میں سے جو بزرگ موجود ہو وہ اپنے سر سے عمامہ اتار کر بچے کو چلتے ہوئے مارتا ہے۔ اس طرح کہ بچہ گر پڑے۔ اور اس کی بڑی خوشی سے شادی کرتے ہیں۔ جب اکبر سو ابرس کا ہوا اور پانچ چلنے لگا تو ماہم نے مرزا عسکری سے کہا کہ یہاں تم ہی اس کے باپ کی جگہ ہو۔ اگر یہ رسم ادا ہو جائے تو شفقت بزرگانہ سے بعید نہ ہوگا۔ اکبر کہا کرتا تھا کہ ماہم کا

یہ کہنا اور مرزا عسکری کا عمامہ پھینکنا اور اپنا گزنا وہ ساری صورت حال مجھے اب تک یاد ہے۔ انھیں دونوں میں سر کے بال بڑھانے کو بابا حسن ابدال کی درگاہ میں لے گئے تھے کہ قندھار میں ہو۔ وہ بھی آج تک مجھے یاد ہے۔

جب ہمایوں ایران سے پھر اور افغانستان میں آمد آمد کا نغل ہوا تو مرزا عسکری اور کامران گھبرائے۔ آپس میں دونوں کے نامہ و پیام دوڑنے لگے۔ کامران نے لکھا کہ اکبر کو ہمارے پاس کابل میں بھیج دو۔ مرزا عسکری نے یہاں مشورت کی۔ بعض سرداروں نے کہا کہ بھائی اب پاس آ پہنچا ہے۔ اعزاز و اکرام سے بھتیجے کو بھیج دو۔ اور اُسی کو عفو و تقصیرات کا وسیلہ قرار دو۔ بعض نے کہا کہ اب صفائی کی گنجائش نہیں رہی۔ مرزا کامران ہی کا کہنا مانیں۔ مرزا عسکری کو بھی یہی مناسب معلوم ہوا۔ اکبر کو سب متعلقوں کے ساتھ کابل بھیج دیا۔

مرزا کامران نے انھیں خان زادہ بیگم اپنی پھوپھی کے گھسٹیں اُتر وایا۔ اور ان کے کاروبار بھی انھیں کے سپرد کیے۔ دوسرے دن باغ شہر آرا میں دربار کیا۔ اور اکبر کو بھی دیکھنے کو بلایا۔ اتفاقاً شبنم کا دن تھا۔ دربار خوب آراستہ کیا تھا۔ وہاں رسم ہے کہ نچے اُس دن چھوٹے چھوٹے نقاروں سے کھیلتے ہیں۔ مرزا ابراہیم اُس کے بیٹے کے لیے

رنگین و نگارین نقارہ آیا اُس نے لے لیا۔ اکبر بچہ تھا۔ کیا سمجھتا تھا کہ میں کس حال میں ہوں۔ اور یہ کیا وقت ہے۔ اُس نے کہا کہ یہ نقارہ میں لوں گا۔ مرزا کا مران تو پورے حیا دار تھے۔ انھوں نے بھیتھے کی دلداری کا ذرا خیال نہ کیا۔ کہا کہ اچھا۔ دونوں کشتی لڑو۔ جو پچھاڑے اُسی کا نقارہ۔ یہی خیال کیا ہو گا کہ میرا بیٹا اس سے بڑا ہے۔ مار لے گا۔ یہ شرمندہ بھی ہو گا اور چوٹ بھی کھائے گا۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات ہوتے ہیں۔ وہ فونہال اقبال مندران باتوں کو ذرا خیال میں نہ لایا۔ جھٹ لڑنے کو آگے بڑھا۔ پسٹ کر گتھ منٹھ ہو گیا اور ایسا بے لاگ اٹھا کہ مارا کہ دربار سے غل اٹھا۔ کامران کچھ شرمندہ ہوا اور کچھ اپنے حال کو سوچ کر چپ رہ گیا کہ آنا راجھے نہیں۔ ادھر والے باغ باغ ہو گئے۔ اور اندر اندر آپس میں یہ کہا کہ اسے کھیل نہ سمجھو۔ یہ باپ کا دام نہ دولت لیا ہے۔

جب ہمایوں نے کابل فتح کیا تو اکبر دو برس دو مہینے آٹھ دن کا بیٹے کو دیکھ کر آنکھیں روشن کیں۔ اور خدا کا شکر بجالایا۔ چند روز کے بعد تجویز ہوئی کہ ختنے کی رسم ادا کی جائے۔ بیگم وغیرہ حرم سرا کی بی بیان قندھار میں تھیں وہ بھی آئیں۔ اس وقت عجب تماشہ ہوا۔ ظاہر ہے کہ جب ہمایوں اور اُس کے ساتھ بیگم ایران کو گئے تھے اُس وقت اکبر کی کیا بساط تھی۔ دنوں اور مہینوں کا ہو گا۔ اتنی سی جان۔ کیا جانے کہ ماں کون ہے۔ اب جو

سواریاں آئیں تو ان سب کو لا کر محل میں بٹھایا۔ اکبر کو بھی لائے اور کہا جاؤ
 مرزا! اماں کی گود میں جا بیٹھو۔ بھولے بھالے نچنے نے پہلے تو بیچ میں کھڑے
 ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔ پھر خواہ دانش خداداد کو خواہ دل کی کشش کو۔ خواہ
 لہو کا جوش کو۔ سیدھا ماں کی گود میں جا بیٹھا۔ ماں برسوں سے بچھڑی
 ہوئی تھی۔ آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ گلے سے لگایا اور پیشانی پر بوسہ
 دیا۔ اس عمر پر اس کی سمجھ اور پہچان پر سب کو بڑی بڑی امیدیں ہوئیں۔
 ۱۵۴۷ء میں جب کامران پھر باغی ہوا تو کابل کے اندر تھا۔ ہمایوں
 باہر گھیرے پڑا تھا۔ ایک دن دھاوے کا ارادہ تھا۔ باہر سے گولے
 برسائے شروع کیے۔ اکثر اشخاص کے گھر اور گھر والے اندر تھے۔ خود ہمایوں
 کے لشکر میں شامل تھے بے درد کامران نے ان کے گھر لوٹ لیے۔
 ننگ و ناموس برباد کیے۔ ان کے بچوں کو مار مار کر فیصل پر سے پھنکوا یا۔
 عورتوں کی چھاتیاں باندھ باندھ کر لٹکایا۔ غضب کیا کہ جس موزے پر
 گولوں کا زور تھا۔ پونے پانچ برس کے معصوم بھتیجے کو وہاں بٹھایا۔ ماہم
 نے گود میں دجا لیا۔ اور ادھر سے پیٹھ کر کے بیٹھ گئی کہ اگر گولہ لگے تو بلا سے
 پہلے میں پیچھے بچہ۔ ہمایوں کے لشکر میں کسی کو اس حال کی خبر نہ تھی۔ یکایک
 توپ چلتے چلتے بند ہو گئی۔ کبھی ہتھاب دکھائی تو رنجاک چاٹ گئی۔ کبھی گولہ
 اگل دیا۔ سنبھل غاں میر آتش بڑا تیز نظر تھا۔ اس نے غور سے دیکھا

تو سامنے آدمی بیٹھا معلوم ہوا۔ دریافت کیا تو یہ حقیقت حال معلوم ہوئی۔
(دربار اکبر)

ابوالفیض فیضی فیاضی

(از پروفیسر محمد حسین آزاد دہلوی)

۱۵۴۷ء میں جبکہ ہندوستان کی سلطنت سلیم شاہ کی سلامتی میں متفکر تھی۔ شیخ مبارک شہر آگرہ میں چار باغ کے پاس رہتے تھے کہ نہال امید میں پہلا پھول کھلا۔ اقبال پُچھا کہ مراد کا پھل لایا گیا۔ کامیاب ہو گا اور کامیابی پھیلائے گا۔ ابوالفیض اس کا نام ہی۔ معصوم بچہ باپ کی نحوست کے سایہ میں پلا۔ وہ افلاس کی خشک سالی اٹھاتا۔ عداوت اعدا کے کانٹے کھاتا جوانی کی بہار کو پہنچا۔

اس نے علم و فضل کا سرمایہ باپ سے پایا۔ اور علوم عقلی و نقلی جو ایشیا میں مروج تھے۔ ان میں مہارت حاصل کی۔ مگر فن شعر میں جو کمالات دکھائے وہی ثابت کرتے ہیں کہ فیضی کا دل و دماغ فیضانِ تمدن سے شاداب تھا۔ اور ملک الشعراء اپنی شاعری ساتھ لے کر آیا تھا۔ باپ اگرچہ شاعر نہ تھا۔ لیکن ہمہ دال فاضل تھا بیٹے کے کلام کو دیکھتا تھا۔ اُسے نکتہ نکتہ سے آگاہ کرتا تھا۔ زبان کو فصاحت کی چاٹ لگاتا تھا۔ اور اُس

سے رموز سخن کے سرچشمے کھولتا تھا۔ فنِ طب کو حاصل کیا۔ مگر اس سے فائدہ فقط اتنا لیا کہ بندگانِ خدا کو معاالجہ سے فیض پہنچاتا تھا اور کچھ اجرت نہ لیتا تھا۔ جب ہاتھ میں زیادہ رسانی ہوئی تو دوا بھی اپنے پاس سے دینے لگا۔ جب خدا نے دستِ گاہِ بڑھائی اور فرصت نے تنگی کی تورفاہ کی نظر سے ایک شفا خانہ بنو ادیا۔

شیخ فیضی۔ جس کا آئے دن کے صدیوں نے قافیہ تنگ کر رکھا تھا اب اُس کی طبیعت ذرا کھلنے لگی۔ شاخِ طبع سے جو پھول جھڑتے اُن کی مہک میدانِ عالم میں پھیل کر دربار تک پہنچنے لگی۔ ۱۷۷۹ء میں بادشاہی لشکر نے چٹوڑ پر علم اُٹھائے تھے جو کسی تقرب سے دربار میں اس کا ذکر ہوا۔ کمال کے جوہری کو جو اہر کے شوق نے ایسا بیقرار کیا کہ فوراً طلب فرمایا۔ دشمن بھی لگے ہی ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنے حسنِ طلب کو طلبیِ عتاب کے پیرایہ میں ظاہر کیا۔ اور حاکمِ آگرہ کے نام لکھا کہ فوراً گھر سے بلاؤ اور سواروں کے ساتھ روانہ کرو۔ کچھ رات گئی تھی کہ چند ترکوں نے آکر گھر پر غل مچایا۔ انھیں کیا خبر تھی کہ ہم بادشاہ کے شوق کا گدستہ لینے آئے ہیں یا مجرم کے کپڑے کر آئے ہیں۔ دشمنوں نے بہادرانِ شاہی کو بہکا دیا تھا کہ شیخ بیٹے کو چھپائے کیسے گا اور چیلے حوالے کرے گا۔ ڈراوے اور دھمکاوے کے بغیر نہ دیگا۔ اتفاقاً

فیضی باغ میں سیر کو گئے تھے اور اہل حسد کا سارا مطلب یہ تھا کہ وہ
 ڈر کر بھاگ جاوے۔ کچھ نہ ہو تو شیخ اور اُس کے عیال تھوڑی دیر
 پریشانی میں تو رہیں۔ شیخ کو خبر ہوئی اُس نے بے تکلف کہہ دیا کہ گھر
 میں نہیں۔ سپاہی اُن بک بے عقل۔ نہ خود کسی کو سمجھیں نہ کوئی اُن کی
 سمجھے۔ اس پر بادشاہی حکم اور شیطانوں نے دل میں وسوسہ ڈالا ہو۔
 قریب تھا کہ خناسوں کا وسواس سچ کا روپ بدل کر کچھ فتنہ برپا کر دے
 کہ اتنے میں فیضی بھی اُن پہنچے۔ بے جیا۔ بے شرم شرمندہ ہو گئے۔ آمدنی
 کے رستے بند تھے۔ سفر کا سامان کہاں۔ بارے شاگردوں اور اہل
 ارادت کی سعی سے یہ مشکل بھی آسان ہو گئی۔ اور رات ہی کو فیضی
 روانہ ہو گئے۔ گھر اور گھر آنے کے لوگ غم میں ڈوب گئے کہ دیکھیے
 اب کیا ہوتا ہے۔ کئی دن کے بعد خبر پہنچی کہ خسرو آفاق نے غریب
 نوازی فرمائی ہے۔ کچھ خطر کا مقام نہیں۔

وہ بلند خیال شاعر کہ شگفتہ مزاج عالم تھا۔ اپنی شگفتہ بیانی۔
 دانش خدا داد۔ اور فراخ دانی کی بدولت نہایت کم عرصہ میں
 درجہ مصاحبت تک پہنچ گیا اور چند ہی روز میں ایسا ہو گیا کہ مقام
 ہو یا سفر۔ کسی عالم میں بادشاہ کو اُس کی جدائی گوارا نہ تھی۔ اس نے
 اعلیٰ درجہ کا اعتبار پیدا کیا۔ ابوالفضل بھی دربار میں بلائے گئے۔ اور

یہ عالم ہوا کہ مہماتِ سلطنت میں کوئی بات بغیر ان کی صلاح کے نہ ہوتی۔

فیضی نے کوئی ملکی و مالی خدمت نہیں لی۔ اور ایسا ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ اوہ ہر ہاتھ ڈالنا تو پہلے شاعری سے ہاتھ اٹھاتا۔ لیکن ملک و مال کے جزوی معاملے اس کی صلاح پر منحصر تھے۔

جو شاہزادہ پڑھنے لکھنے کے قابل ہوتا تھا۔ اکبر اُس کی اُستادگی سے فیضی کو اعزاز دیتا تھا۔ کہ تعلیم و تربیت کرو چنا پختہ سلیم۔ مراد۔ و انیال سب اس کے شاگرد تھے اور اسے بھی اس امر کا بڑا فخر تھا۔ سلاطین چغتائیہ میں ملک الشعراء خطاب سب سے اول غزالی شہیدی کو ملا ہے۔ اس کے بعد شیخ فیضی کو ملا۔ یہ خطاب بھی اُس نے اپنی درخواست سے نہ لیا تھا۔ اُس کو اعلیٰ درجہ کی قربت اور اقتدار حاصل تھا۔ مگر اس نے کسی منصب یا حکومت کی ہوس نہ کی۔ ملک سخن کی حکمرانی خدا سے لایا تھا۔ اسی پر قانع تھا۔ اور یہ کچھ تھوڑی نعمت تو نہیں تھی۔ اکبر اُس کو اور اُس کے مرصع کلام کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ بلکہ اُس کی بات بات کو خلعت اور دربار کا سنگار جانتا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ دونوں بھائی ہر خدمت کو ایسی سنجیدگی اور خوبصورتی سے بجالاتے ہیں کہ جو اس کے لیے مناسب ہو۔ اس سے بھی بہتر

درجہ پر پہنچا دیتے ہیں اور ہر کام کو جانفشانی اور دلی عرق ریزی سے بجالاتے ہیں اس واسطے اپنی ذات سے انھیں وابستہ سمجھتا تھا۔ اور بہت خاطر داری اور دلدادگی سے کام لیتا تھا۔ فیضی کو کچھ فرمائش کی تھی چھنور میں کھڑے لکھ رہے تھے۔ اکبر چپ تھا اور ان کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتا تھا۔ بیرو بھی بڑے منہ چڑھے ہوئے تھے۔ انھوں نے کچھ بات کی۔ اکبر نے آنکھ سے منع کیا اور کہا ”مست بولو“ شیخ جیو کچھ لکھ رہے ہیں، اس فقرے سے اور وقت اخیر کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ انھیں شیخ جیو شیخ جی (کما کر) تھا۔

اخیر میں سب سے دل اٹھایا تھا۔ اور مرض بھی کسی جمع ہو گئے تھے دونوں بالکل چپ رہے۔ شاہ دانش نواز خود خبر کو آئے۔ پکارا تو آنکھ کھولی۔ آداب بجالا کر کچھ کہہ سکے۔ دیکھ کر رہ گئے۔

ہاے افسوس! اس موقع پر حکم بادشاہی کا کیا زوچل سکتا تھا۔ انھوں نے بھی رنج کھایا۔ اور آنسو پنی کر چلے گئے۔ ۱۰ صفر ۱۰۸۵ء بھتی جو فضل و کمال کے گھر سے نالہ ماتم کا شور اٹھا۔ شعر و سخن نے نوحہ خوانی کی کہ لفظوں کا صراف اور معنی کا مرنے کا رہ گیا۔

”عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں ”آدھی رات بھتی۔ اور وہ حالت نزع میں تھا کہ بادشاہ خور آئے۔ بیہوش تھا۔ مجت سے اس کا

سرکپڑ کر اٹھایا۔ اور کئی دفعہ پکار پکار کر کہا۔ شیخ جیو۔ ہم حکیم علی کو ساتھ لائے ہیں۔ تم بولتے کیوں نہیں۔ بیہوش تھا۔ صدا اندا کچھ نہ تھی۔ دوبارہ پوچھا تو پکڑی زمین پردے ماری۔ آخر شیخ ابو الفضل کو تسلی دیکر چلے گئے۔ ساتھ ہی خبر پہنچی کہ اُس نے اپنے تئیں حوالہ کر دیا (مر گیا)

(دربار اکبری)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شہرتِ عام اور بقا و دوام کا دربار

(از پروفیسر مولوی محمد حسین آزاد)

خواب میں دیکھتا ہوں کہ گویا میں ہوا کھانے چلا ہوں اور چلتے چلتے ایک میدان وسیع الفضا میں جانکلا ہوں جسکی وسعت اور دلفزائی میدان خیال سے بھی زیادہ ہے۔ دیکھتا ہوں کہ میدان مذکور میں اس قدر کثرت سے لوگ جمع ہیں کہ نہ انھیں محاسب فکر شمار کر سکتا ہے نہ قلم فرست تیار کر سکتا ہے۔ اور جو لوگ اس میں جمع ہیں وہ غرض مند لوگ ہیں کہ اپنی اپنی کامیابی کی تدبیروں میں لگے ہوئے ہیں۔ وہاں ایک پہاڑ ہے جس کی

چوٹی گوشِ پنجاب سے سرگوشیاں کر رہی ہی۔ پہلو اس کے جس طرف سے دیکھا ایسے سر پھوڑا اور سینہ توڑ ہیں کہ کسی مخلوق کے پاؤں نہیں جمنے دیتے۔ ہاں حضرت انسان کے ناخن تدبیر کچھ کام کر جائیں تو کر جائیں۔ میرے دوستو! اس رستہ کی دشواریوں کو سر پھوڑا اور سینہ توڑ پہاڑوں سے تشبیہ دیکر ہم خوش ہوتے ہیں مگر نامنصفی ہے۔ پتھر کی چھاتی اور لوہے کا کلیجہ کر لے تو ان بلاؤں کو جھیلے۔ جن پر وہ صیبتیں گزریں وہی جائیں۔ یکایک قلعہ کوہ سے ایک شنائی کی سی آواز آنی شروع ہوئی۔ یہ دلکش آواز سب کو بے اختیار اپنی طرف کھینچتی تھی اس طرح کہ دل میں جان اور جان میں زندہ دلی پیدا ہوتی تھی بلکہ خیال کو وسعت کے ساتھ ایسی رفعت دیتی تھی جس سے انسان مرتبہ انسانیت سے بھی بڑھ کر قدم مارنے لگتا تھا۔ لیکن یہ عجب بات تھی کہ اتنے ابنوہ کثیر میں سے تھوڑے ہی اشخاص تھے جن کے کان سننے کی قابلیت یا اس کے نغموں کا مذاق رکھتے تھے۔

ایک بات کے دیکھنے سے مجھے نہایت تعجب ہوا۔ اور وہ تعجب فوراً جاتا بھی رہا۔ یعنی دوسری طرف جو نظر جا پڑی تو دیکھتا ہوں کہ کچھ خوبصورت عورتیں ہیں اور بہت سے لوگ ان کے تماشائے جمال میں محو ہو رہے ہیں۔ یہ عورتیں پریوں کا لباس پہنے ہیں۔ مگر یہ بھی وہیں

چرچا سنا کہ وحقیقت نہ وہ پریاں ہیں نہ پری زاد عورتیں ہیں۔
 کوئی ان میں غفلت کوئی عیاشی ہے۔ کوئی خود پسندی
 کوئی بے پروائی ہے۔ جب کوئی ہمت والا ترقی کے رستہ میں
 سفر کرتا ہے تو یہ ضرورتی ہیں۔ انہیں میں پھنس کر اہل ترقی اپنے مقاصد
 سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ان پر درختوں کے جھنڈ سایہ کیسے ہوئے
 تھے۔ رنگ برنگ کے پھول کھلے تھے۔ گوناگوں جھوم رہے تھے۔
 طرح طرح کے جانور بول رہے تھے۔ پیچھے قدرتی تنہریں اور پٹھنڈی ٹھنڈی
 ہوائیں چل رہی تھیں۔ وہیں دانش فریب پریاں پتھروں کی سلوں
 پر پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھیں اور آپس میں چھٹیں لڑ رہی تھیں
 مگر ایسے ایسے الجھاوے بلندی کوہ ادھر ہی ادھر تھے۔ یہ بھی صاف
 معلوم ہوتا تھا کہ جو لوگ ان جبلی پریوں کی طرف مایل ہیں وہ اگرچہ اقوام
 مختلفہ۔ عہد ہائے متفرقہ۔ عمر ہائے متفاوتہ رکھتے ہیں مگر وہی ہیں جو
 دراصلہ کے جھوٹے ہمت کے بیٹے اور طبیعت کے پست ہیں۔

دوسری طرف دیکھا کہ جو بلند حوصلہ صاحب ہمت عالی طبیعت تھے
 وہ ان سے الگ ہو گئے اور غول کے غول شنائی کی آواز کی طرف
 بلندی کوہ پر متوجہ ہوئے جس قدر یہ لوگ آگے بڑھتے تھے اُسی قدر وہ
 آواز کانوں کو خوش آئند معلوم ہوتی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ بہت سے

چیدہ اور برگزیدہ اشخاص اس ارادے سے آگے بڑھے کہ بلندی کوہ پر
چڑھ جائیں۔ اور جس طرح ہو سکے پاس جا کر اس نعمتِ آسمانی سے وقتِ روحانی
حاصل کریں۔ چنانچہ سب لوگ کچھ کچھ چیزیں اپنے اپنے ساتھ لینے لگے۔
معلوم ہوتا تھا کہ گویا آگے کے راستہ کا سامان لے رہے ہیں۔ سامان
بھی ہر ایک الگ الگ تھا۔ کسی کے ایک ایک ہاتھ میں کاغذوں کے
اجزاء تھے۔ کسی کی بغل میں ایک کپاس تھی۔ کوئی پنسیس لیے تھا۔ کوئی
جہازِ قطب نما اور دوورین سنبھالے تھا۔ بعضوں کے سر پر تاج شاہی
دھرا تھا بعضوں کے تن پر لباس جنگی آراستہ تھا۔ غرض کہ علم ریاضی
اور جبرِ ثقیل کا کوئی آلہ نہ تھا جو اس وقت کام میں نہ آ رہا ہو اسی عالم میں
دیکھتا ہوں کہ ایک فرشتہ رحمت میرے دامن ہاتھ کی طرف کھڑا ہو
اور مجھے بھی اس بلندی کا شائق دیکھ کر کہتا ہو کہ یہ سرگرمی اور گرم جوشی تمہاری
ہمیں نہایت پسند ہو اس نے یہ بھی صلاح دی کہ ایک نقاب منہ پر
ڈال لو میں نے بے تاملِ ثقیل کی۔ بعد اس کے کہ وہ مذکور فرقہ فرقہ میں
منقسم ہو گیا کوہ مذکور پر رستوں کا کچھ شمار نہ تھا۔ سب نے ایک ایک
راہ پکڑ لی۔ چنانچہ کچھ لوگوں کو دیکھا کہ چھوٹی چھوٹی ٹھٹھائیوں پر بولیے۔ وہ تھوڑے
ہی دور چڑھے تھے کہ ان کا راستہ ختم ہوا اور وہ تھم گئے۔ مجھے معلوم ہوا
کہ ان پست ہمتوں نے صنعتِ گرمی اور دستکاری کی راہ لی تھی کہ روپیہ

کے بھوکے تھے اور جلد محنت کا صلہ چاہتے تھے۔ میں ان لوگوں کے پیچھے
 تھا کہ جنہوں نے دلاوروں اور جاں بازوں کے گروہ کو پیچھے چھوڑا
 تھا اور خیال کیا تھا کہ چڑھائی کے رستے ہم نے پایلے مگر وہ رستے ایسے
 ہیچ در ہیچ اور درہم برہم معلوم دیے کہ تھوڑا ہی آگے بڑھ کر اس کے
 ہمیر پھیر میں سرگرداں ہو گئے۔ ہر چند برابر قدم مارے جاتے
 تھے مگر جب دیکھا تو بہت کم آگے بڑھتے تھے۔ میرے فرشتہ رحمت
 نے ہدایت کی کہ یہ وہی لوگ ہیں جہاں عقل صادق اور عزم کامل
 کام دیتا ہے وہاں چاہتے ہیں فقط چالاکی سے کام کر جائیں۔ بعضے
 ایسے بھی تھے کہ بہت آگے بڑھ گئے تھے مگر ایک ہی قدم ایسا
 بے موقعہ پڑا کہ جتنا گھٹنوں میں بڑھے تھے اتنا دم بھر میں نیچے
 آن پڑے۔ بلکہ بعضے ایسے ہو گئے کہ پھر چڑھنے کے قابل ہی نہ رہے۔
 اس سے وہ لوگ مراد ہیں کہ جو مدد روزگار سے ترقیاً حاصل
 کرتے چلے جاتے ہیں مگر کوئی ایسی حرکت ناشایستہ کرتے ہیں کہ فوٹہ
 گر پڑتے ہیں اور آئندہ کے لیے بالکل اس سے علاقہ ٹوٹ جاتا ہے۔

۱۵ فی الحقیقہ جو ناموری اور ترقی کے خواہاں ہیں اگر سلطنت، حکومت، دولت، شجاعت، عیلت وغیرہ کے رستے
 سے چاہتے ہیں تو خوف جان ہزاروں فنون کمال کے رستے لیتے ہیں تو حامد انواع و اقسام کی بدذاتیوں کو سہراہ ہوتے ہیں۔

ہم اتنے عرصے میں بہت اونچے چڑھ گئے اور معلوم ہوا کہ جو چھوٹے بڑے رستے پھاڑ کے نیچے سے چلتے ہیں اوپر آکر دو شاہراہوں سے ملتے ہیں۔ چنانچہ وہاں آکر تمام صاحب ہمت دوگردہوں میں منقسم ہو گئے۔ ان دونوں شاہراہوں میں ذرا آگے بڑھ کر ایک ایک بھوت ڈراؤنی صورت ہیبت ناک صورت کھڑا تھا کہ آگے جانے سے روکتا تھا۔ بھوت کا نام دیو ہلاک تھا اور کانٹے دیو تری کے مانع اور موت کے بہانے تھے۔ جوالو الغرموں کو راہ تری میں پیش آتے ہیں چنانچہ جو سامنے آتا تھا ٹھننے کی مار منہ پر کھاتا تھا۔ دیو کی شکل ایسی خود بخوار تھی گویا موت سامنے کھڑی ہو۔ ان کانٹوں کی مار سے غول کے غول اہل ہمت کے بھاگ بھاگ کر پیچھے ہٹتے تھے اور ڈر ڈر کر چلاتے تھے کہ ہر ہر موت! ہر ہر موت!! دوسرے رستے پر جو بھوت تھا اُس کا نام حسد تھا۔ پہلے بھوت کی طرح اس کے ہاتھ میں کچھ نہیں تھا لیکن ڈراؤنی آواز اور بھونڈی صورت اور مکروہ و معیوب کلمے جو اُس کی زبان سے نکلتے تھے اس لیے اُس کا منہ ایسا بُرا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی طرف دیکھا نہ جاتا تھا اُس کے سامنے ایک کچر کا وزن بھرا تھا کہ ہمارے چھینٹیں اُڑائے جاتا تھا اور ہر ایک سفید پوش کے کپڑے خراب کرتا تھا۔ جب یہ حال دیکھا تو اکثر اشخاص ہم میں سے نے دل

ہو کر رہ رہ گئے اور بعض نے اپنے یہاں تک آنے پر کمالِ نادوم ہوئے۔
 میرا یہ حال تھا کہ یہ خطرناک حالتیں دیکھ دیکھ کر دل ہراساں ہوا جاتا تھا اور
 قدم آگے نہ اٹھتا تھا۔ اتنے میں اس شہنائی کی آواز اس تیزی کے ساتھ
 کان میں آئی کہ مجھے ہوئے ار اوے پھر چپک اُٹھے۔ جس قدر کہ دل
 زندہ ہوئے اسی قدر خوف و ہراس خاک ہو ہو کر اُڑتے گئے۔ چنانچہ بہت
 سے جاں باز جو شمشیریں علم کیے ہوئے تھے اس کڑک دمک سے
 قدم مارتے آگے بڑھے گویا حریف سے میدانِ جنگ مانگتے ہیں۔
 یہاں تک کہ جہاں دیو کھڑا تھا یہ اُس دہانہ سے نکل گئے اور وہ
 موت کے دانت نکالے دیکھتا رہ گیا۔ جو لوگ سنجیدہ مزاج اور طبیعت
 کے دھیمے تھے وہ اس رستے پر پڑے جدھر حسد کا بھوت کھڑا تھا
 مگر اس آواز کے ذوقِ شوق نے انھیں بھی ایسا مست کیا کہ گالیاں کھاتے
 کیچڑ میں نہاتے مرنے کی یہ بھی اُس کی حد سے نکل گئے چنانچہ جو کچھ رستے
 کی صعوبتیں اور خرابیاں تھیں وہ ان بھوتوں ہی تک بچتے آگے دیکھا
 تو ان کی دستِ رس سے ماہر ہیں اور رستہ بھی صاف اور تہوار بلکہ ایسا
 خوشنما ہے کہ مسافر چلا آئے بڑھے اور ایک سپاٹے میں پہاڑ کی
 چوٹی پر پہنچ جائے اس میدانِ روح افزا میں پہنچتے ہی ایسی جاں نغش
 اور روحانی ہوا چلنے لگی جس سے روح اور زندگانی کو قوتِ دہائی حاصل

ہوتی تھی۔ تمام میدان جو نظر کے گرد و پیش دکھائی دیتا تھا اُس کا رنگ
 کبھی نورس تھا اور کبھی شام و شفق جس سے قوس قزح کے رنگ میں
 کبھی شہرت عام اور کبھی بقائے دوام کے حروف عیاں تھے اور نور
 و سرور کا عالم دل کو اس طرح تسلی و تشفی دیتا تھا کہ خود بخود پچھلی محنتوں کے
 غبار دل سے دھوئے جاتے تھے۔ اور اس مجمع عام میں امن امان اور
 دلی آرام پھیلتا تھا جس کا سرور لوگوں کے چہروں سے پھولوں کی شادابی
 ہو کر عیاں تھا۔ ناگماں ایک ایوان عالی شان دکھائی دیا کہ اُس کے چار
 طرف پھانک تھے۔ اُس پہاڑ کی چوٹی پر دیکھا کہ پھولوں کے تختہ میں
 ایک پری جو شمال چاندی کی کُرسی پر بیٹھی ہو اور وہی شہنائی بجا رہی
 ہے جس کے میٹھے میٹھے سُروں نے ان مشتاقوں کے انہوہ کو یہاں تک
 کھینچا تھا۔ پری ان کی طرف دیکھ کر مسکراتی تھی اور سُروں سے اب لہجی
 صدا آتی تھی گویا آنے والوں کو آفریں و شاباش دیتی ہو اور کہتی ہو
 کہ ”خیر مقدم! خیر مقدم!! خوش آمدید صفا آوردید“ اس آواز سے
 یہ خدائی لشکر کئی فرقوں میں منقسم ہو گیا۔ چنانچہ مورخوں کا گروہ ایک
 دروازہ پر ایستادہ ہوا تاکہ صاحب مراتب اشخاص حسب مدارج
 ایوان جلوس میں داخل کرے۔ یکا یک وہ شہنائی جس سے کبھی
 شوق انگیز وجوش خیز اور کبھی جنگی باجوں کے سُر نکلتے تھے۔ اب اُس

ظفر یابی اور مبارکبادی کی صدا آنے لگی۔ تمام مکان گونج اٹھا۔ اور دروازے خود بخود کھل گئے جو شخص سب سے پہلے آگے بڑھا معلوم ہوا کہ کوئی راجا کا راجہ مہاراجہ ہے۔ چاند کی روشنی چہرہ کے گرد ہالہ کیسے ہے۔ سر پر سویرج کی کرن کا تاج ہے۔ اس کے استقلال کو دیکھ کر لٹکا کا کوٹ پانی پانی ہوا جاتا ہے اُس کی حق داری جنگل اور پہاڑوں کے حیوانوں کو جان نثاری میں حاضر کرتی ہے۔ تمام دیوی دیوتا دامنوں کے سایہ میں لیے آتے ہیں۔ فرقہ فرقہ کے علما اور مورخ اسے دیکھتے ہی شاہانہ طور سے لینے کو بڑھے اور وہ بھی متانت اور انکسار کے ساتھ سب سے پیش آیا۔ مگر ایک شخص کُن سالہ رنگت کا کالا ایک پوختی بغل میں لیے ہندوؤں کے غول سے نکلا اور باواز بلند چلا یا کہ آنکھیں والو کچھ خبر ہے؟ دیکھو! دیکھو!! ترتیب کے سلسلہ کو برہمن نہ کرو اور نرن کار کے نور کو اجسام خاک میں نہ ملاؤ۔ یہ کہہ کر آگے بڑھا اور اپنی پوختی نذر گزرائی۔ اُس نے نذر قبول کی اور نہایت خوشی سے اس کے لینے کو ہاتھ بڑھایا تو معلوم ہوا کہ اس کا ہاتھ بھی فقط سویرج کی کرن تھا۔ سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ کوئی کچھ سمجھا کوئی کچھ سمجھا اُس وقت ایک بان یعنی تخت ہوا دار آیا وہ اس پر سوار ہو کر آسمان کو اڑ گیا معلوم ہوا کہ یہ راجا چندرجی تھے اور یہ والمیک ہے جس نے رامائن نذر دی۔ سب لوگ ابھی

والمیک کی ہدایت کا شکریہ ادا کر رہے تھے کہ اتنے میں ایک اور آمد آمد ہوئی۔ دیکھا کہ ایک تخت طلسمات کو ۲-۳ پریاں اڑائے لیے آتی ہیں اس پر ایک اور راجہ بٹھا ہے مگر نہایت یربہ سال۔ اسے فرقہ فرقہ کے علما اور مورخ لینے کو نکلے مگر پڈت اور مہاجن لوگ بہت بقیاری سے دوڑے معلوم ہوا کہ راجہ تو ہمارا راجہ پکرماجیت تھے اور تخت سنگھاسن بتیسی پریاں اتنی بات لکھ کر ہوا ہو گئیں کہ جب تک سورج کا سونا اور چاند کی چاندی چمکتی ہے نہ آپ کا سنہ ہٹے گا نہ سکے مٹے گا۔ برہمنوں اور پڈتوں نے تصدیق کی اور انھیں لے جا کر ایک سند پر بٹھا دیا۔

ایک راجہ کے آنے پر لوگوں میں کچھ قیل وقال ہوئی کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ اپنے دو مصاحبوں کو بھی ساتھ لے جائے۔ اور اراکین دربار کہتے تھے کہ یہاں تکنت اور غرور کا گذارہ نہیں۔ اتنے میں وہی ۲-۳ پریاں پھر آئیں۔ چنانچہ ان کی سفارش سے اُسے بھی لے گئے۔ جس وقت راجہ نے سند پر قدم رکھا ایک پڈت آیا دونوں ہاتھ اٹھا کر اشیر باد کی اور بقائے دوام کا تاج سر پر رکھ دیا جس میں ہیرے اور پتے کے نو دانے ستاروں پر آنکھ مار رہے تھے معلوم ہوا کہ وہ راجہ بھوج تھے اور بتیسی پریوں کا جھرمٹ وہی

کتاب نگاہاں بتیسی تھی جو ان کے عہد میں تصنیف ہوئی اور جس نے تاج سر پر رکھا وہ کالی داس شاعر تھا جس نے ان کے عہد میں نوکتابیں لکھ کر فصاحت اور بلاغت کو زندگی جاوید بخشی۔ اس طرف تو برابر یہی کاروبار جاری تھے۔ اتنے میں معلوم ہوا کہ دوسرے دروازہ سے بھی داخلہ شروع ہوا۔ میں اُس طرف متوجہ ہوا۔ دیکھتا ہوں کہ وہ کمرہ بھی فرش و فرش چھاڑ فانوس سے بقتہ نور بنا ہوا ہے۔ ایک جوان پہل پیکر ہاتھ میں گرز گا و سر شہ شجاعت میں مست جھومتا جھامتا چلا آتا ہے۔ جہاں قدم رکھتا ہے ٹخنہ تک زمین میں ڈوب جاتا ہے گرد اُس کے شاہان کیانی و پہلوان ایرانی موجود ہیں۔ کہ درفش کاویانی کے سایہ بے زوال میں لیے آتے ہیں۔ حُب قوم اور حُب وطن اُس کے دایئیں اور بائیں پھول بہاتے تھے اُس کی نگاہوں سے شجاعت کا خون ٹپکتا تھا اور سرور کلمہ شیر کا خود فولادی دھرا تھا سوخ اور شعرا اس کے انتظار میں دروازہ پر کھڑے تھے۔ سب نے اُسے بچشم تعظیم دیکھا انھیں میں سے ایک پیر مرد دیرینہ سال جس کے چہرے سے مایوسی اور ناکامی کے آثار آشکارا تھے وہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گیا اور ایک کرسی پر بٹھایا۔ جسے بجائے پایوں کے چار شیر کندھوں پر اٹھائے ہوئے تھے۔ پھر پیر مرد نے اہل مجلس کی طرف متوجہ ہو کر چہرہ اشعار

نہایت زور و شور کے پڑھے نہیں بلکہ اُس کے کارناموں کی تصویرِ صفحہ ہستی پر ایسے رنگ سے کھینچی جو قیامت تک رہے گی۔ بہادر پہلوان نے اٹھکراُس کا شکریہ ادا کیا اور گلِ فردوس کا ایک طرہ اُس کے سر پر آویزاں کر کے دعا کی کہ اتنی یہ بھی قیامت تک شگفتہ اور شاداب رہے تمام اہلِ محفل نے آمین کہی۔

معلوم ہوا کہ وہ بہادر ایران کا حامیِ شیرستانی رستم پہلوان ہے اور کُن سالِ یایوس فردوسی ہر جو شاہِ نامہ لکھکراُس کے انعام سے محروم رہا۔

بعد اُس کے ایک نوجوان آگے بڑھا جس کا حسنِ شبابِ نوخیز آور دل بہادری اور شجاعت سے لبریز تھا۔ سر پر تاجِ شاہی تھا مگر اس سے ایرانی پہلوانی پہلو چُرانی تھی۔ ساتھ اس کے حکمتِ یونانی سر پر چھتر لگائے تھی۔ میں نے لوگوں سے پوچھا۔ مگر سب اُسے دیکھ کر ایسے محو ہوئے کہ کسی نے جواب نہیں دیا۔ بہت سے مورخ اور محقق اُس کے لینے کو بڑے مگر سب ناواقف تھے۔ وہ اُس تخت کی طرف سے چلے جو کہا نیوں اور افسانوں کے ناموروں کے لیے تیار ہوا تھا۔ چنانچہ ایک شخص جس کی وضع اور لباس سب سے علیحدہ تھا ایک انبوہ کو چیر کر نکلا وہ کوئی یونانی مورخ تھا۔ اُس نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اندر

بیجا کر سب سے پہلی کرسی پر بٹھا دیا۔ فرشتہ رحمت نے میرے کان میں کہا کہ تم اس گوشہ کی طرف آ جاؤ تاکہ تمہاری نظر سب پر پڑے اور تمہیں کوئی نہ دیکھے۔ یہ سکندر یونانی ہے جس کے کارنامے لوگوں نے کہانی اور افسانے بنا دیئے ہیں۔

اس کے پیچھے ایک بادشاہ آیا کہ سر پر کلاہ کیانی اور اُس پر فرش کاویانی جھومتا تھا مگر پھر بریا علم کا پارہ پارہ ہو رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اس طرح آتا تھا گویا اپنے نغم کو بچائے ہوئے آتا ہے۔ رنگ زرد تھا اور شرم سے سر جھکائے تھا۔ جب وہ آیا تو سکندر بڑی عظمت کے ساتھ استقبال کو اُٹھا اور اپنے برابر بٹھا لیا باوجود اس کے سکندر جس قدر زیادہ تعظیم کرتا تھا اُس کی شہرندگی زیادہ ہوتی تھی وہ دارا بادشاہ ایران تھا۔

دفعۃً سکندر نے آواز دی ”اُنھیں لاؤ“ جو شخص داخل ہوا وہ ایک پیر مرد بزرگ صورت تھا کہ مقیشتی داڑھی کے ساتھ بڑھاپے کے نور نے اُس کے چہرے کو روشن کیا تھا۔ ہاتھ میں عصاے پیری تھا۔ جس وقت وہ آیا سکندر خود اُٹھا اُس کا ہاتھ پکڑ لایا۔ اپنے برابر کرسی پر بٹھایا اور پانچ لڑی کا سہرا اُس کے سر پر باندھا معلوم ہوا کہ یہ نطامی گنجوی ہیں اور اس سہرے میں خمسہ کے مضامین سے پھول پروئے ہوئے ہیں۔ سکندر پھر اُٹھا اور تھوڑا سا پانی اُس پر چھڑک کر کہا ”اب یہ کبھی نہ کہلائیں گے“

بعد اس کے جو شخص آیا اگرچہ سادہ وضع تھا مگر قیافہ اور روشن چہرہ
 فرحت روحانی سے شگفتہ نظر آتا تھا۔ جو لوگ اب تک آپکے تھے اُن سے
 زیادہ عالی رتبہ کے لوگ اُس کے ساتھ تھے۔ اُس کے داہنے ہاتھ پر
 افلاطون تھا اور بائیں پر جالینوس اُس کا نام سقراط تھا۔ چنانچہ
 وہ بھی ایک مسند پر بیٹھ گیا۔

لوگ ایسا خیال کرتے تھے کہ ارسطو اپنے استاد یعنی افلاطون سے
 دوسرے درجہ پر بیٹھے گا۔ مگر اس مقدمہ پر کچھ اشخاص تکرار کرتے نظر آئے
 کہ اُس کا سر گروہ عذارِ سبطو تھا۔ اس منطقی زبردست نے کچھ شوخی
 اور کچھ سینہ زوری سے مکر دلائل زبردست اور بُراہین معقول کے
 ساتھ سب اہل محفل کو قائل کیا اور کہا کہ یہ مسند میرا ہی حق ہے اور یہ کمرا ول
 سکندر کو آئینہ دکھایا پھر نظامی کو سلام کر کے بیٹھ گیا۔

ایک گروہ کثیر بادشاہوں کے ذیل میں آیا سب جبّہ و عمامہ اور
 طبل و دمامہ رکھتے تھے۔ مگر باہر روکے گئے۔ کیونکہ ہر چند اُن کے جبّے
 دامن قیامت سے دامن باندھے۔ اور عمامے گنبد ملک کا نمونہ تھے
 مگر اکثر اُن میں طبل تھی کی طرح اندر سے خالی تھے۔ چنانچہ دو شخص اندر آنے
 کے لیے منتخب ہوئے اُن کے ساتھ ایک ابنوہ کثیر علما و فضلا کا ہو لیا تعجب
 یہ کہ روم و یونان کے فلسفی ٹوپیاں اتارے اُن کے ساتھ تھے

بلکہ چند ہندو بھی تقویم کے پترے لیے اشیر باد کہنے آئے تھے۔ پہلا بادشاہ ان میں ہارون الرشید اور دوسرا مامون الرشید تھا۔
تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ ایک اور تاجدار سامنے سے نمودار ہوا۔

ولایتی استخاں اور ولایتی لباس تھا اور جامہ خون سے قلم کار تھا۔
ہندوستان کے بہت سے گراں بہا زیور اُس کے پاس تھے۔ مگر چونکہ ناواقف تھا اس لیے کچھ زیور ہاتھ میں لے کر نکلتے ہوئے تھے۔ ہر چند یہ جواہرات اپنی آبداری سے پانی ٹپکاتے تھے مگر جہاں قدم رکھتا تھا بجائے غبار کے آہوں کے دھوئیں اُٹھتے تھے۔ وہ محمود غزنوی تھا۔ بہت سے مصنف اُس کے استقبال کو بڑھے مگر وہ کسی اور کام نظر اور شتاق معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک نوجوان عورت شامل آیا اور فردوسی کا ہاتھ پکڑ کر محمود کے سامنے لے گیا۔ محمود نے نہایت اشتیاق اور شکر گزاری سے ہاتھ اُس کا پکڑا۔ اگرچہ برابر بیٹھ گئے مگر دونوں کی آنکھیں شرم سے جھک گئیں۔ نوجوان ایک عجیب ناز و انداز سے مسکرایا اور چلا گیا وہ اپنا رخ تھا۔ اسی عرصہ میں ایک اور شخص آیا کہ لباس اہل اسلام کا رکھتا تھا مگر چال و حال یونانیوں سے ملتا تھا۔ اس کے داخل ہونے پر شعرا تو الگ ہو گئے مگر تمام علما اور فضلاء میں تکرار اور قیل و قال کا غل ہوا۔ اُس سینہ زور نے سب کو پیچھے چھوڑا اور اسطو کے مقابل میں ایک کرسی بھی تھی اُس پر آکر بیٹھ گیا وہ بوعلی سینا تھا۔

ایک انبوہ کثیر ایرانی تورانی لوگوں کا دیکھا کہ سب معقول اور خوش وضع لوگ تھے مگر انداز ہر ایک کے جُدا جُدا تھے۔ بعض کے ہاتھوں میں اجڑا اور بعض کی بغل میں کتاب تھی کہ اوراق اُن کے نقش و نگار سے گلزار تھے۔ وہ دعوے کرتے تھے کہ ہم معانی و مضامین کے مصوٰر ہیں۔ اُن کے باب میں بڑی تکراریں ہوئیں۔ آخر یہ جواب ملا کہ تم مصوٰر نے شک چھتے ہو مگر بے اصل اور غیر حقیقی اشیاء کے مصوٰر ہو۔ تمہاری تصویروں میں اصلیت اور واقعیت کا رنگ نہیں۔ البتہ انتخاب ہو سکتا ہے یہ لوگ فارسی زبان کے شاعر تھے۔ چنانچہ النوری۔ خاقانی۔ ظہیر فریابی وغیرہ چند اشخاص منتخب ہو کر اندازے باقی سب لوگ نکالے گئے۔

ایک شاعر کے کان پر قلم دھرا تھا۔ اُس میں سے آبِ حیات کی بوندیں ٹپکتی تھیں مگر کبھی کبھی اُس میں سے سانپ کی زبانیں لہراتی نظر آتی تھیں۔ اس لیے اس پر پھر تکرار ہوئی اُس نے کہا کہ بادشاہوں کو خدا نے دفعِ اعداء کے لیے تلوار دی ہے مگر ملکِ مضامین کے عالم سوکے قلم کے کوئی حربہ نہیں رکھتے۔ اگر چند بوندیں زہر آب کی بھی نہ رکھیں تو اعدائے بدنہاد ہمارے خونِ عزت کے بہانے سے کسب چوکیں۔

چنانچہ یہ عذر اُن کا قبول ہوا۔ یہ النوری تھا جو باوجود گل افشانی فصاحت کے بعض موقع پر اس قدر ہجو کرتا تھا کہ کان اُس کے سننے کی تاب نہیں

رکھتے۔ خاقانی پر اس معاملہ میں اُس کے اُسناد کی طرف سے دعوے
 پیش ہوئے۔ چونکہ اُس کی بنیاد خانگی نزاع پر تھی اس لیے وہ بھی اُس کی کُرسی
 نشینی میں غلغلہ انداز نہوسکا۔ اسی عرصہ میں **چنگیز خاں** آیا۔ اُس کے لیے
 گو علما اور شعرا میں سے کوئی آگے نہ بڑھا بلکہ جب اندر لائے تو خاندانی
 بادشاہوں نے اُسے چشمِ حقارت سے دیکھ کر تبسم کیا۔ البتہ مورخوں
 کے گروہ نے بڑی دھوم دھام کی جب کسی کی زبان سے نسب نامہ کا
 لفظ نکلا تو اُس نے فوراً شمشیر جو ہر دارِ سند کے طور پر پیش کی جس پر غنی
 حرفوں سے رستم تھا ”سلطنت میں میراث نہیں چلتی“ علما نے
 غلچا یا کہ جس کے کپڑوں سے لہو کی بو آئے وہ قصاب ہو۔ بادشاہوں
 میں اس کا کام نہیں۔ شعرا نے کہا کہ جس تصویر کے رنگ میں ہمارے قلم
 یا مصوران تصانیف کی تحریر نے رنگ بقائے ڈالا ہو اُسے اس دربار
 میں نہ آنے دیں گے۔ اس بات پر اُس نے بھی تامل کیا اور متناصف
 معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت ہاتھ نے آواز دی کہ اے **چنگیز** جس
 طرح ملک و شمشیر کے جوش کو قوم کے خون میں حرکت دی۔ اگر علوم و فنون
 کا بھی خیال کرتا تو آج قومی بہم رومی کی بدولت ایسی ناکامی نہ اٹھاتا
 اتنے میں چند مورخ آگے بڑھے۔ انھوں نے کچھ ورق دکھائے کہ
 اُن میں **نورہ چنگیز خانی** یعنی اُس کے ملکی انتظام کے قواعد لکھے تھے

آخر قرار پایا کہ اُسے دربار میں جگہ دو۔ مگر اُن کا غدوں پر کچھ لہو کے چھینٹے دو اور ایک سیاہی کا داغ لگا دو۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ ایک جوان اسی شکوہ و نشان کا اور آیا۔ اُس کا نام ہلاکو خاں تھا۔ اُس کے لیے چند علماء نے بھی مورخوں کا ساتھ دیا۔ جس وقت اندر لائے تو اُس کے لیے بھی تکراروں کا غل ہوا چاہتا تھا۔ مگر ایک مرد بزرگ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھایا۔ جس کی وضع تشرع عالموں کی تھی۔ لیکن مگر میں ایک طرف اُصطرباب دوسری طرف کچھ اقلیدس کی شکلیں لٹکتی تھیں۔

بغل میں فلسفہ اور حکمت کے چند اجزاء تھے۔ اُن کا نام محقق طوسی تھا۔ چنانچہ انھیں دیکھ کر کوئی بول نہ سکا۔ اسے تو بادشاہوں کی صف میں جگہ مل گئی۔ محقق کو شیخ بوعلی سینا نے یہ کہہ کر بٹھالیا کہ آپ نے میری کلاہ شہرت میں بقائے دوام کے آبدار موتی ٹانگے بشکریہ ادا کرتا ہوں۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ امیر تیمور کی نوبت آئی۔ بہت سے

۱۵ اس کے عہد میں علوم و فنون نے بڑی ترقی کی تھی۔ خصوصاً علم ہیئت کی کتابیں اور تصانیف کی تعمیر اس کی شاہکار ہے ۱۲

مورخوں نے اس کے لانے کی التجا کی مگر وہ سب کو دروازہ پر چھوڑ گیا۔ اور اپنا آپ رہبر ہوا۔ کیونکہ وہ خود مورخ تھا۔ رستہ جانتا تھا اور اپنا مقام پہچانتا تھا۔ لنگڑا تا ہوا گیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ تیمور کرسی پر بیٹھ ہی تموار ٹیک کر اٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ اے اہل تصنیف میں تم سے سوال کرتا ہوں کہ ہماری شمشیر کے عوصن جو خدا نے تجھیں قلمِ تحریر دیا ہے اُسے اظہارِ واقعیت اور خلافت کی عبرت اور نصیحت کے لیے کام میں لانا چاہیے یا اغراضِ نفسانی اور بد زبانی ہیں؟ تمام مورخ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے کہ یہ کس پر اشارہ ہے؟ اُس وقت تیمور نے **ابن عرب شاہ** کے بولنے کو ایما فرمایا۔ معلوم ہوا کہ وہ کہیں بیٹھے رہ گیا۔ چنانچہ اُس کا نام مصنفوں کی فہرست سے نکالا گیا۔

اسی حال میں دیکھتے ہیں کہ ایک بزرگ آزاد و ضعیف قطع تعلق کا لباس بریں۔ خاکساری کا عمامہ سر پر آہستہ آہستہ چلے آتے ہیں۔ تمام علما و صلی۔ مورخ اور شاعر سر جھکا کر ان کے ساتھ ہیں۔ وہ دروازہ پر آکر کھڑے۔ سب نے آگے بڑھنے کو التجا کی تو کہا معذور رکھو۔ میرا بسے مقدموں میں کیا کام ہے۔ اور فی الحقیقہ وہ معذور رکھے جاتے۔ اگر تمام اہل دربار کا شوق طلب ان کے انکار پر غالب نہ آتا۔ وہ اندر آئے۔ ایک طلسمات کا شیشہ

مینائی اُن کے ہاتھ میں تھا کہ اُس میں کسی کو دودھ۔ کسی کو شربت۔
 کسی کو شراب شیرازی نظر آتی تھی۔ ہر ایک کرسی نشین انھیں اپنے
 پاس بٹھانا چاہتا تھا۔ مگر وہ اپنی وضع کے خلاف سمجھکر کہیں نہ بیٹھے۔
 فقط اس سرے سے اس سرے تک ایک گردش کی اور چلے گئے۔ وہ
حافظ شیراز تھے اور شیشہ مینائی اُن کا دیوان تھا جو فلک
 مینائی کے دامن سے دامن باندھے ہے۔ لوگ اور کرسی نشین کے
 مشتاق تھے کہ دور سے دیکھا بے شمار لڑکوں کا غول غل مچاتا چلا
 آتا ہے۔ بیچ میں اُن کے ایک پیر مرد نورانی صورت جس کی سفید
 داڑھی میں شگفتہ مزاجی نے کنگھی کی تھی اور خندہ جبینی نے ایک طرہ
 سر پہ آویزاں کیا تھا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں گلہ ستہ دوسرے میں
 ایک میوہ دار ٹہنی پھلوں پھولوں سے ہری بھری تھی۔ اگرچہ مختلف
 فرقوں کے لوگ تھے جو باہر استقبال کو کھڑے تھے مگر انھیں دیکھکر
 سب نے آگے قدم بڑھاے کیونکہ ایسا کون تھا جو **شیخ سعیدی**
 اور ان کی **کستان**۔ **بوستان** کو نہ جانتا تھا۔ انھوں نے
 کمرہ کے اندر قدم رکھتے ہی سعد زنگی کو پوچھا۔ اُس بیچارے کو
 ایسے درباروں میں بار بھی نہ تھی لیکن اور کرسی نشین کہ اکثر اُن سے
 واقف تھے۔ اور اکثر اشتیاق غائبانہ رکھتے تھے وہ اُن کے مشتاق

معلوم ہوے باوجود اس کے یہ ہنسنے اور اتنا کم کر اپنے لڑکوں کے لشکر میں چلے گئے ”دنیا دیکھنے کے لیے جی برتنے کے لیے نہیں“

بعد اس کے دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ چنانچہ ایک اور العزم شخص آیا جس کے چہرہ سے خود سری کا رنگ چمکتا تھا اور سینہ زوری کا جوش بازوں میں بل مارتا تھا۔ اُس کے آنے پر تکرار ہوئی اور مقدمہ یہ تھا کہ اگر علما کی نہیں تو مورخوں کی کوئی خاص سند ضرور چاہیے ہے۔ بلکہ چغتائی خاندان کے مورخ صاف اُس کی مخالفت پر آمادہ ہوئے۔ اُس نے باوجود اس کے ایک کرسی پر جس پر تیموری تختہ بھی لگا تھا گھسیٹ لی اور بیٹھ گیا۔ ہمالیوں اسے دیکھ کر شرمایا اور سر جھکا لیا۔ مگر پھر تاج شاہی پر انداز کج کلاہی کو بڑھا کر بیٹھا اور کہا کہ بے حق بے استقلال ہے۔ اُس نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا کہ مجھے اتنا فخر کافی ہے کہ میرے دشمن کی اولاد میرے رستہ پر قدم بدم چلیں گے اور فخر کریں گے۔

مختوری دیر کے بعد ایک خوبشید کلاہ آیا جس کو انہوہ کثیر برائی تو رانی۔ ہندوستانیوں کے فرقہ ہائے مختلف گانچ میں لیے آتا تھا۔ وہ جس وقت آیا تو تمام اہل دربار کی نگاہیں اُس کی طرف اٹھیں۔ اور غماندہ عام کی ہوا چلی۔ تعجب یہ ہے کہ اکثر مسلمان اُس کو سہان سمجھتے تھے۔ ہندو اسے ہندو جانتے تھے۔ آتش پرستوں کو آتش پرست دکھائی دے رہا تھا

لضارے اُس کو لضارے سمجھتے تھے مگر اُس کے تاج پر تمام سنسکرت
حروف لکھے تھے۔ اُس نے اپنے بعض ہم قوموں اور ہم مذہبوں کی
شکایت کر کے بد اوئی پر خون کا دعوے کیا کہ اُس نے میری جیسا
جاودانی کو خاک میں ملانا چاہا تھا اور وہ فحیاب ہوتا اگر چند منصف مصنفوں
کے ساتھ ابو الفضل اور فیضی کی تصنیف میری سیجائی نہ کرتی۔
سب نے کمائیت کا پھل ہے۔

اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا جو اپنی وضع سے ہندو
راجہ معلوم ہوتا تھا وہ خود مخمور نشہ میں چور تھا ایک عورت صاحب
جمال اُس کا ہاتھ پکڑے آتی تھی اور جدھر چاہتی تھی پھراتی تھی۔ وہ
جو کچھ دیکھتا تھا اُس کے نورِ جمال سے دیکھتا تھا اور جو کچھ کہتا تھا اسی کی
زبان سے کہتا تھا۔ اس پر بھی ہاتھ میں ایک جزو کاغذوں کا تھا۔
اور کان پر قلم دھرا تھا۔ یہ سانگ دیکھ کر سب مسکراے مگر چونکہ اہل
اس کے ساتھ تھی اور اقبال آگے آگے اہتمام کرتا آتا تھا اس لیے
بدست بھی نہ ہوتا تھا۔ جب نشہ سے آنکھیں کھلتی تھیں تو کچھ لکھ بھی
لیتا تھا۔ وہ جہانگیر تھا اور بیگم نور جہاں تھی۔

شاہ جہاں بڑے جاہ و جلال سے آیا۔ بہت
سے مورخ اس کے ساتھ کتابیں بغل میں لیے تھے۔ اور شاعر اس کے

آگے آگے قصیدے پڑھتے آتے تھے۔ میر عمارت اُن عمارتوں کے نوٹو ہاتھ میں لیے تھے۔ جو اُس کے نام کے کتابے دکھاتی بھیتیں۔ اور سیکڑوں برس کی رافٹک اُس کا نام روشن دکھاتی بھیتیں۔ اس کے آنے پر رمضان دمی عام کا غلغلہ بلند ہوا چاہتا تھا کہ ایک نوجوان آنکھوں سے اندھا چند بچوں کو ساتھ لیے آیا کہ اپنی آنکھوں کا اور بچوں کے خون کا دعویٰ کرتا تھا۔ یہ شہر پار شاہ جہاں کا چھوٹا بھائی تھا اور بچے اس کے بھتیجے تھے۔ اس وقت وزیر اس کا آگے بڑھا اور کہا کہ جو کیا گیا بد نیتی اور خود غرضی سے نہیں کیا گیا بلکہ خدا کے امن اور ملک کا انتظام قائم رکھنے کو کیا۔ بہر حال اُسے دربار میں حکہ ملی اور سلاطین چغتائیہ کے سلسلہ میں مغز درجہ پر ممتاز ہوا۔

ایک تاجدار آیا کہ جبہ اور عمامہ سے وضع زادانہ رکھتا تھا۔ ایک ہاتھ سے تہیچ پھیرتا جاتا تھا۔ مگر دوسرے ہاتھ میں جو فرد حساب تھی اُس میں غرق تھا۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ اس کی میزان کو پڑتا تھا ہے سب نے دیکھ کر کہا کہ اُنھیں خانقاہ میں لیجا نا چاہیے۔ اس دربار میں اس کا کچھ کام نہیں۔ لیکن ایک ولایتی کہ بظاہر مقطع اور معقول نظر آتا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر آگے بڑھا اور کہا کہ اے ار اکین دربار ہمارے ظل سبحانی نے اس کمبخت سلطنت کے لیے بھائی

سے لیکر باپ تک کا لحاظ نہ کیا۔ اس پر بھی تمہارے اعتراض اُسے اس دبا
 میں جگہ نہ دیں گے۔ یہ لطیفہ اُس نے اس مسخرے پن سے ادا کیا
 کہ سب مُسکراے اور تجویز ہوئی کہ تمہاری خاندان کے سب سے
 اخیر میں انہیں بھی جگہ دیدو۔ معلوم ہوا کہ وہ عالمگیر بادشاہ اور
 ساتھ اُس کے نعمت خاں عالی تھا۔

اس کے ساتھ ہی ایک بینڈ اچان دکھنی وضع جنگ کے ہتھیار
 لگائے راجگی کے سکے تنغے سے سجا ہوا آیا۔ اُس کی طرف لوگ متوجہ
 نہ ہوئے بلکہ عالمگیر کچھ کہنا بھی چاہتا تھا مگر وہ کرسی کھینچ کر اُس کے سامنے
 ہی بیٹھ گیا اور بولا کہ صاحب ہمت کو جگہ دو یا نہ دو وہ آپ جگہ پیدا
 کر لیتا ہے۔ یہ جوابی تھا جس سے مرہٹہ خاندان کی بنیاد
 قائم ہوئی ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد دور سے گانے بجانے کی آواز آئی
 اور بعد اس کے بادشاہ آیا۔ اس کی وضع ہندوستانی تھی۔
 ساتھ میں دو خوں میں سے کوئی اس کے ساتھ نہ تھا البتہ چند اشخاص
 تھے کہ کوئی ان میں گداور بھانڈ کوئی مسخرانہ نظر آتا تھا۔ یہ سب گھبرائے
 برسے آئے۔ تھے کیونکہ ایک ولایتی دلاور اُن کے پیچھے پیچھے شمشیر ہنر
 علم کیے تھا۔ اس کی اصفہانی تلوار سے اس کی بوندیں ٹپکتی تھیں۔ محل

رومی کی کلاہ بھٹی جس پر ہندوستان کا تاج شاہی نصب تھا اور
اسپ بخارانی زیرِ ران تھا۔ وہ ہندوستانی وضع بادشاہ محمد شاہ
تھا۔ اُسے دیکھتے ہی سب نے کہا کہ نکالو۔ نکالو۔ ان کا یہاں
کچھ کام نہیں۔ چنانچہ وہ فوراً دوسرے دروازے سے نکالے گئے۔
ولایتی مذکور ناوِ شاہ تھا۔ جس نے سرحد روم سے بخارا تک
فتح کر کے تاج ہندوستان سر پہ رکھا تھا۔ اُسے چنگیز خاں کے پاس
جگہ مل گئی۔

تھوڑی دیر ہوئی تھی جو ایک غول ہندوستانیوں کا پیدا
ہوا۔ ان لوگوں میں بھی کوئی مرتع بغل میں دبائے تھا کوئی گلہ ستہ
ہاتھ میں لیے تھا۔ اُنھیں دیکھ دیکھ کر آپ ہی آپ خوش ہونے لگے۔
اور وجد کر کے اپنے اشعار پڑھتے تھے۔ یہ ہندوستانی شاعر تھے۔
چنانچہ چندر اشخاص منتخب ہوئے۔ ان میں ایک شخص کو دیکھا کہ جب
بات کرتا تھا اُس کے منہ سے رنگارنگ کے پھول جھڑتے تھے۔
لوگ ساتھ ساتھ دامن پھیلائے تھے۔ مگر بعض پھولوں میں کانٹے
ایسے ہوتے تھے کہ لوگوں کے کپڑے پھٹے جاتے تھے۔ پھر بھی
مشتاقِ زمین پر گرنے نہ دیتے تھے۔ کوئی نہ کوئی اٹھا ہی لیتا تھا۔
وہ مرزا رفیع سودا تھے۔

میسر بد دماغی اور بے پروائی سے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتے تھے۔
 شرپٹھتے تھے اور منہ پھیر لیتے تھے۔ درو کی آواز دروناک
 دنیا کی بے بقائی سے جی ہزار کیے دیتی تھی۔ میسر حسن اپنی سحر بیانی
 سے پرستان کی تصویر کھینچتے تھے۔ میرا نشانہ اللہ خاں
 قدم قدم پر نیا بہرہ دے دکھاتے تھے۔ دم میں عالم ذی وقار متقی
 پر بیزگار۔ دم میں وارٹھی چٹ بھنگ کا سوتا کندھے پر۔

جہرا رست کو اگرچہ کوئی خاطر میں نہ لاتا تھا مگر وہ میٹھی آواز
 سے ایک تان اڑاتا تھا تو سب کے سر ہل ہی جاتے تھے۔ ناسخ
 کی گُلکا۔ سی چشم آشنا معلوم ہوتی تھی۔ اور اکثر جبکہ قلم کاری اُس
 کی عینک کی محتاج تھی۔ مگر آتش کی آتش زبانی اُسے جلانے لے
 نہ چھوڑتی تھی۔

موسن کم سخن تھے مگر جب کچھ کہتے تھے جہرا رست کی طرف
 دیکھتے جاتے تھے۔

ایک پیر مردیرینہ سال۔ محمد شاہی دربار کا لباس۔ جامہ
 پہننے کھڑکی دار پگڑی باندھے۔ جریب ٹیکتے آتے تھے۔ مگر ایک
 گھنٹہ کے بانگ پہنچے تیچھے گالیاں دیتے تھے۔ بانگے صاحب
 ضرور اُن کے دست درگاہ ہو جاتے مگر چار خاکسار اور پانچاں

تاجدار اُن کے ساتھ تھا۔ یہ بچا لیتے تھے۔ بڈھے میرامن دہلی
چار درویش کے مصنف تھے اور بانکے صاحب میرسرور
فسانہ عجائب والے تھے۔ ذوق کے آنے پر پند عام کے
عطر سے دربار ہما گیا۔ انھوں نے اندر آکر شاگردانہ طور پر
سب کو سلام کیا۔

سودا نے اٹھ کر ملک الشعرائی کا تاج اُن کے سر پر کھدیا۔
غالب اگرچہ سب سے پیچھے تھے پر کسی سے پیچھے نہ تھے۔ بڑی
دھوم دھام سے آئے اور ایک نقارہ اس زور سے بجایا کہ سب
کے کان گنگ کر دیے۔ کوئی سمجھا اور کوئی نہ سمجھا۔ مگر سب واہ واہ
اور سبحان اللہ کرتے رہ گئے۔

اب میں نے دیکھا کہ فقط ایک کرسی خالی ہے اور بس اتنے
میں آواز آئی کہ آؤ کو بلاؤ۔ ساتھ ہی آواز آئی کہ شائد وہ
اس جگہ میں بیٹھنا قبول نہ کرے۔ مگر وہیں سے پھر کوئی بولا کہ اُسے
جن لوگوں میں بٹھا دو گے بیٹھ جائے گا۔ اتنے میں چند اشخاص نے
غل مچایا کہ اُس کے قلم نے ایک جہان سے لڑائی باندھ رکھی ہے
اُسے دربار شہرت میں جگہ نہ دینی چاہیے۔ اس مقدمہ پر قبیل و قال
شروع ہوئی۔ میں چاہتا تھا کہ نقاب چہرہ سے الٹ کر آگے بڑھوں

اور کچھ بولوں کہ میرے ہادی ہمد یعنی فرشتہ رحمت نے ہاتھ
 پکڑ لیا اور چپکے سے کہا کہ ابھی مصلحت نہیں۔ اتنے میں آنکھ کھل گئی۔
 میں اس جھگڑے کو بھی بھول گیا۔ اور خدا کا شکر کیا کہ بلا سے
 دربار میں کرسی ملی یا نہ ملی۔ مُردوں سے زندوں میں تو آیا۔
 (از نیرنگ خیال)



سوتاڑہ

(از مولوی محمد عزیز مرزا بی۔ اے۔ مرحوم)

ہمارستان فطرت میں پہاڑوں کا ایک عجیب مرتبہ ہے۔
 کیسا ہی معمولی منظر ہو۔ لیکن اگر وہ کسی اوسپنے پہاڑ پر نشی ہوتا ہے
 تو اُس میں عجیب و غریبی پیدا ہو جاتی ہے۔ دور سے سرسبز سر بہ فلک
 کشیدہ پہاڑ نظر آکر مردہ دلوں کو زندہ کرتے ہیں اور جو شفاف
 سیسے چشمے اُن سے جا بجا اُچھلتے کودتے نکلتے ہیں۔ وہ اپنی مجبوری
 قوت سے دریا بہاتے اور عالم کی سرسبزی و شادابی کا موجب
 ہوتے ہیں یہی پہاڑ ہیں جن کا نظارہ انسان کو اپنے بے حقیقتی
 و بے بضاعتی کا دل ہی دل میں قائل کر کے کسی اور عالم میں پہنچا کر
 معرفت الہی کا سبق پڑھاتا ہے۔ اور انھیں پہاڑوں کی تکیا کمروں
 کی خوفناک تنہائی میں نفسِ امارہ کا ستایا ہوا انسان گوشہ گزین
 ہو کر عبادت و ریاضت کی بدولت قیدِ جسمانی سے آزاد ہو کر کسی
 اور ہستی کی سیر کرتا ہے۔ یہی پہاڑ ہیں جو ہزار ہا سال سے پیش
 جو اہرات کو جگر گوشوں کی طرح سینہ میں چھپائے ہوئے چلے آئے
 ہیں۔ اور سختی مقابلہ سے انسان کی بہترین کوششوں کی بھی بے عمل

اُن تک رسائی ہونے دیتے ہیں۔ انہیں پہاڑوں کی چوٹیوں پر کھڑے ہوئے سنگ ریزے ایسے ایسے سمندروں اور دور دراز طوفانوں کی یاد دلاتے ہیں جن کے مقابلہ میں گویا طوفان نوح کل ہوا ہے۔ غرض کہ پہاڑ زمانہ قدیم کی جہاں تک کہ مورخوں کا ذہن بھی رسائی نہیں کر سکتا۔ زندہ تاریخ اور انسان کے لیے عجیب مایہ دولت و عبرت

ہیں۔ ضلع بیڑ کی خوش قسمتی ہے کہ مغربی گھاٹ کا شمالی حصہ آدھے ضلع کو گھیرے ہوئے ہے۔ اور گوان پہاڑوں میں یہ بڑا نقص ہے کہ درختوں سے جو دراصل ان کا زیور ہے بالکل خالی ہیں اور اُن کا بالائی حصہ کوسوں تک انسان و حیوان کی سکونت اور پرورش کے لیے پھیلتا ہوا چلا گیا ہے۔ اور صرف نظر کے قدم قدم چھوٹے اور بڑے گول اور نوک دار روڑوں سے ٹھوکر کھانے سے محسوس ہوتا ہے کہ بالائے کوہ ہیں۔ لیکن پھر بھی کہیں کہیں خصوصاً چڑھاؤ اور اتار پر ایسے ایسے دلفریب سسے سامنے آ جاتے ہیں جو بھولنے سے بھی نہیں بھلائے جاسکتے ہیں۔ اگرچہ گرمیوں کے موسم میں ان کی سطح اور ڈراؤنی بلندی تھکے ماندے مسافروں کا دل دور سے نظر کر بیٹھا دیتی ہے لیکن کسی مقام پر جب قریب پہنچتے ہیں تو اُس کی کافی تلافی ہو جاتی ہے۔

پٹر کے مغرب میں جس مقام پر گھاٹ ختم ہوتا ہے۔ وہاں کی زمین
 عجب زرخیز ہے کوسوں تک جدھر نظر جاتی ہے ہرے بھرے
 کھیتوں کی تازگی کھل الجواہر کا کام کرتی ہے۔ اور برسات کے موسم
 میں خواہ حضرت سیکا کیل کیسی ہی جزور سی فرمائیں مگر وہاں کی سیر
 حاصل زمین محنت کے مارے کسانوں کو وقت پر مالا مال کر دیتی
 ہے۔ جوار کے درخت انسان کے قدم سے ایک ہاتھ اوپچے ہوتے
 ہیں اور بڑے بڑے دانوں کی کثرت سے بالیس بھٹی پڑتی ہیں
 ان زرخیز کھیتوں کا سلسلہ ایک سیدھی ہموار سڑک پر ختم ہوتا ہے
 جو بچھڑا مستقیم گھاٹ سے اُترتے ہوئے گجرات کو جاتی ہے۔ یہ
 کھیت اور یہ سڑک آفتاب کی تیز روشنی میں بالکل ایسے معلوم ہوتے
 ہیں کہ گویا دھانی دوپٹہ پر۔ پہلا ٹھٹھا لگا ہوا ہے اس سڑک کے دوسری
 طرف گھاٹ کے کنارے کے نزویک موضع سوتاڑہ اس طرح واقع
 ہوا ہے کہ گویا کوئی عقاب قلعہ کوہ پر پر پھیلایا ہوئے بیٹھا ہے۔
 اگرچہ مکانات اور باشندوں کی عام حالت اور استقلال کے
 لحاظ سے مرہٹواری کے دوسرے دیہات کے مقابلہ میں سوتاڑہ میں
 کوئی چیز ماہ الامتیاز نہیں ہے۔ لیکن اگر کوہ کے اطراف کی سرسبزی
 و شادابی ٹھنڈی ہوائیں باشندوں کی فارغ البالی اور تواضع

اور سب سے زیادہ وہاں کا دلفریب منظر انسان کے دل پر
عجب اثر ڈالتا ہے۔ موضع کی دوسری طرف بجانب مغرب نصف
میل تک افتادہ زمین کا سلسلہ جو کہیں سے اونچی اور کہیں سے
پہنچی ہے۔ ریشیب و فراز ہستی کا سبق پڑھاتا ہوا گھاٹ کے
کنارے تک چلا گیا ہے۔ وہاں پہنچ کر خدا کی قدرت کا تماشا نظر
آتا ہے۔ اگر ذرا گردن جھکا کر دیکھا جائے تو ایک عین غار نظر آتا ہے
جس کے دونوں طرف سیدھی دیواریں کھڑی ہوئی ہیں۔ یہ دونوں
دیواریں بلکہ زامیہ عائدہ بناتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی فوق الانسان
قوت نے پہاڑ کا ایک مثلث نما ٹکڑہ جدا کر لیا ہے۔ عمق پانچ چھ سو
فٹ سے کم نہیں۔ اور چونکہ اتار بالکل عمودی ہے اس لیے نظر
کا پتہ تھر تھراتی پیچھے اترتی ہے۔ مگر وہاں پہنچ کر جو سماں سامنے
آتا ہے وہ تمام خوف اور تمام رحمت کا کافی بلکہ کافی سے بھی زیادہ
معاوضہ ہوتا ہے۔ چونکہ عرف عام میں اس غار کی گہرائی سوتاڑہ کے
برابر سمجھی جاتی ہے اس لیے موضع کا نام سوتاڑہ رکھا گیا ہے۔

خوف زدہ نگاہ سطح تختانی پر پہنچ کر ہر طرف گھنے درخت دیکھتے ہیں جن
کے گھنگھوڑتوں کی سیاہی بیل سبزی دل پر ایک خاص اثر پیدا کرتی ہے
اور درختوں کے بیچ میں پتیلوں کی سبز نقاب منہ پر ڈالے ہوئے ناہموار

پہاڑی سطح پر ایک بلوریں چشمہ بہتا ہوا نظر آتا ہے۔ جہاں کہیں کے
 پتے زیادہ گھنے نہیں ہیں یا درختوں کی شاخیں آپس میں گھلے ملتی
 ہوئی یا ہوا کے جھونکے نقاب کو ذرا چہرے سے ہٹا دیتے ہیں۔
 چشمہ کے شفاف پانی کو نوزانی جھلک انسان کی اپنی ہستی کو جھلا کر
 کسی اور ہستی کو یاد دلاتی ہے۔ غور سے دیکھتے ہیں تو پانی میں کسی
 گنبد نما عمارت کا عکس پتھ و تاب کھاتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور جب
 سایہ سے اسل کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے تو ڈھونڈتے ڈھونڈتے
 گھنے پتوں کی گہری سبزی سے کوئی سفید سفید چیز جس نے منظر کو
 اور بھی دلربا بنا دیا ہے۔ جھانکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے جس مقام
 پر غاکاغ بصورت زانو ختم ہوتا ہے وہاں کچھ اور ہی کیفیت ہے۔
 ہر طرف سے چھوٹے چھوٹے چشمے بہتے چلے آتے ہیں اور غار کے
 قریب پہنچ کر ان کا منتشر پانی ایک تیز پہاڑی چشمے کی شکل میں نمودار
 ہوتا ہے جو شور مچاتا۔ اُچھلتا کودتا۔ مچلتا کنارہ تک پہنچتا ہے۔ اور
 وہاں اپنی سطح کو جس کی تلاش میں اس قدر سرگردان و پریشان ہونا
 پڑا ہی نہ پا کر بے قرار ہوتا ہے اور اُسی کرب و اضطراب کے عالم
 میں ایک جھلانگ ایسی مارتا ہے کہ سُنہ کے بل گرنا ہے۔ یہ نماشنا
 دیکھ کر انسان اس قدر محو ہو جاتا ہے کہ اس کا بے اختیار جی چاہتا ہی

کہ ذرا سنبھلے اتر کر اسی بہار جہاں فزا کا لطف اور بھی اچھی طرح اٹھائیں۔ مگر پہلے یہ عموماً اُتار دل بیٹھا دینے والی گہرائی اور اونچی اونچی ناہموار سیڑھیاں اُس کے پاؤں پکڑ لیتی ہیں۔ مگر شوق اسے اس زور سے ڈھکیلتا ہے کہ بے اختیار اُس کے قدم حرکت میں آتے ہیں۔ اور اُن انگریز سیڑھیوں کو جن کے بنانے میں دست صنعت کا بہت ہی کم دخل ہے۔ جس طرح بنتا ہے طے کرتا ہوا ایک ایسے مقام پر پہنچتا ہے جہاں کچھ دوڑھیلو ان چٹان کے سوا کوئی اور شے نظر نہیں آتی۔ مجبور بیٹھ کر پھسلنے لگتا ہے اور جب تھوڑی دیر میں سیڑھیاں نمودار ہو جاتی ہیں تو پھر پہلے کی طرح گرتا پڑتا آگے بڑھتا ہے۔ اور خدا خدا کر کے کوئی آدھ گھنٹے سخت محنت میں جو اُس کو پسینے پسینے کر دیتی ہے پینے کی سطح پر قدم رکھتا ہے۔ مگر وہاں پہنچتے ہی ایسا ہوش بے سین دیکھتا ہے جو تمام کلفتوں کو اُن کی آن میں بھلا دیتا ہے۔ دوطرف سے سربفلک کشیدہ سنگلاخ دیواریں نظر کو روکتی ہیں۔ جن پر جا بجا کسی دیہاتی مگر ہمدرد انسان نقاش نے اپنے غیر تربیت یافتہ ہاتھوں سے آدمی نمائندوں کی انگریز تصویریں ناواقف اُترنے والوں کی رہبری کے لیے بنا دی ہیں جنوب کی طرف جہاں تک نظر جاتی ہے کھیت ہی کھیت پھیلے ہوئے چلے گئے ہیں جن میں ایک

شفاف ندی جس کا پاٹ فاصلہ کے ساتھ جاتا ہے بہ رہی ہو۔
 شمال کی آبشار ریل کی طرح شور مچاتی ہوئی گر رہی ہو۔ مگر درختوں کے
 جھرمٹ کی وجہ سے نظر نہیں آتی۔ بیچ میں ایک بلورین چشمہ اپنی پہاڑی
 ندی میں عجب مستانہ چال سے لڑکھڑاتا۔ قدم قدم پر گول اور نوکدار
 چو پہل چھوٹے اور بڑے سنگریزوں سے ٹکڑے کھاتا ہوا بہ رہا ہے اور
 ہر طرف بڑے بڑے درخت اُس کے سرد اور شفاف پانی کو آفتاب
 کی گرمی اور پہاڑی ہواؤں کے تند جھونکوں سے محفوظ رکھنے کے
 لیے ہر طرف چھتریوں لگائے کھڑے ہیں۔ جن میں سے چھن چھن کر
 آفتاب کی زرد کرنیں سطح آب پر گرتی اور متاب کے چھوٹے کاسماں
 دکھائی دیتیں۔ چشمہ کے اُدھر پتوں میں چھپی ہوئی وہی عمارت جس کا عکس
 اوپر سے آیا تھا دکھائی دیتی ہے اور جب چشمہ کو عبور کر کے دوسری
 طرف پہنچتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بلند کرسی پر ایک چھوٹا سا مندر ہے
 جو کسی فطرت پرست رشی نے اس ہوش و رہا مقام میں جہاں ہر شے
 صالح حقیقی کی لاجواب صنعت کا پتہ دے رہی ہے۔ اطمینان قلب
 سے صحیفہ فطرت کی ورق گردانی میں مصروف رہ کر راز ہستی کے
 حل کرنے کی نیت سے بنایا ہے۔ اس دلربا مندر کی سیر اور اُس کے
 پانی کے لاجواب انتخاب پر داد دے کر انسان درختوں کے سایہ میں

چشمے کے کنارے کنارے اُس کی دل لہانے والی خوش فلیوں کا نظارہ کرتے ہوئے شمال کی طرف بڑھتا ہے اور جو نہی کہ درختوں کے جھنڈ سے سر نکالتا ہے ایک عجب جانفزا منظر کے سامنے آ جاتا ہے شور ایسا ہی کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ مگر معلوم یہ ہوتا ہی کہ ایک دریا اُڈا چلا آتا ہے جس سے نظر کو حیرت کے ساتھ تسکین بھی ہو جاتی ہے۔ جب عالم محویت میں قدم بڑھاتا اور بھی قریب ہوتا اور نظر اٹھا کر دیکھتا ہے تو پہلے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک بلور کی چادر ہوا میں لٹکی ہوئی ہے مگر کسی قدر پیچھے آ کر اُس چادر کے ٹکڑے ہو کر کئی دھاریں بن جاتی ہیں اور تھوڑی دور تک یہی کیفیت رہتی ہے۔ پھر چھوٹی دھار بڑی بوندوں کی شکل میں منتقل ہوتی ہے جن کی جسامت فاصلہ کے ساتھ گھٹتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ پیچھے پہنچتی ہیں تو چھوٹے ہوتے ہوتے جزوالات تجزئے کا ثبوت دیتی ہوئی دھوئیں کی شکل میں نمودار ہوتی ہیں۔ لیکن یہاں کی خاک بھی اکسیر کا حکم رکھتی ہے کہ یہ مہووم اجزاء مائی سطح تختانی سے طعن ہوتے ہی پھر ایک زوردار چشمہ بن جاتے ہیں۔ یہ نظارہ اس قدر دلفریب ہے کہ انسان گھنٹوں تک عالم محویت میں نظر جمائے کھڑا رہتا ہے۔ پھر دفعتاً خیال آتا ہے کہ شام ہوئی جاتی ہے واپس چلنا چاہیے مگر شوق کے تقاضے

اور بہت دلانے سے یہاں تک تو پہنچا دیا تھا لیکن اب واپسی کا رے
 وارد - بہر حال جس طرح بھی ممکن ہے بادل ناخوستانہ گرتا پڑتا بیٹھتا
 اٹھتا جا بجا پانی سے حلق کو تر کرتا ہوا اوپر پہنچتا ہے اور تھک تھکا کر
 بدن تختہ سا ہو جاتا ہے اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ
 ہم خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا -

(انتخاب رسالہ غزن)



مہمان و میزبان

(از مولوی مشتاق حسین صاحب وقار الملک بہادر)

مہمانی اور میزبانی کی خوبیاں اور برکتیں ایسی صریح اور صاف ہیں
 کہ اُن کے بیان کی کچھ حاجت نہیں ہے - آپس میں محبت اور ارتباط
 بڑھانے کے واسطے یہ رسم بہت ہی مؤثر ثابت ہوئی ہے - اس
 رسم سے غیر بھی اپنے ہو جاتے ہیں بلکہ دشمن بھی دوست بن جاتے
 ہیں اور اُسی کے جاری نہ رہنے سے قریب تر غزنیوں کی قدرتی
 محبت میں بھی کمی آ جاتی ہے - پس جو شے اس قدر مفید ہو مناسب

ہم کہ وہ ہر ایک قسم کے نقصانات اور خرابیوں سے پاک و صاف رہے ورنہ اُس کے تمام فائدے برباد ہو جائیں گے۔ لیکن جس طریقے پر اس عرصہ میں ہم لوگوں میں مہمانی اور میزبانی ہوتی ہے وہ کچھ مفید نہیں ہے بلکہ اعتراض کے قابل ہے اور کچھ شبہ نہیں کہ موجودہ رسم و رواج کے سبب سے اکثر اوقات مہمان اور میزبان دونوں کو تکلیف ہوتی ہے اس لیے ضرور ہے کہ مسلمان موجودہ طریقہ مہمانی اور میزبانی پر غور کریں اور بقدر اصلاح اس میں ضروری ہو وہ عمل میں لادیں۔

اب ہم اُن خرابیوں کا بیان کرتے ہیں جو قابل اعتراض ہیں سب سے بڑی غلطی جو اکثر مہمانوں کی طرف سے ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنے میزبان کو پہلے سے اپنے آنے کی خبر نہیں کرتے حالانکہ اس بے خبر وارد ہونے سے میزبان کو بڑی تکلیف ہوتی ہے اور خود مہمان کو بھی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے علاوہ اس کے اس طرح پر بے خبر کسی کے مکان پر بطور مہمان کے وارد ہونا خلاف تہذیب بھی ہے۔

اکثر یہ ہوتا ہے کہ گھر والے کھانے سے فارغ ہو جاتے ہیں اُس کے بعد مہمانوں کی آمد ہوتی ہے اور اُس وقت ایک تازہ

تسلیش پیش آتی ہے ادھر تو کھانے کا سرانجام نہیں ہوتا اور
ادھر یہ خیال ہوتا ہے کہ مہمانوں کے واسطے کھانے میں دیر نہ ہو۔ نوکر
چاکر جن کو دوبارہ پھر چو لھا جھونکنا پڑتا ہے جُدا دل میں ناخوش ہوتے ہیں
اور اگر کبھی رات کو ناوقت یہ مہمان داری پیش آگئی تو اور زیادہ مصیبت
آتی ہے اور یہ آفت خاص کر اُن مقامات میں زیادہ آتی ہے جو ریل
کے اسٹیشنوں سے قریب ہیں اب یہ ہوتا ہے کہ رات کے گیارہ
یا بارہ بج گئے ہیں یا رات ڈھل گئی ہے اور پچھلا پہرہ ہے سب
لوگ اپنے آرام کی نیندیں لے رہے ہیں کہ یکایک دروازہ پر سے
آوازیں آتی شروع ہوئیں (کوڑا کھولو کوڑا کھولو) پھر بعض سونے والے
ایسے غافل سوتے ہیں کہ مشکل سے جاگتے ہیں یا دروازہ سے بہت
فاصلہ سے ہوتے ہیں یا جاڑوں کے موسم میں مکانوں کے اندر کوڑا بند
کر کے سوتے ہیں ایسی صورت میں بے خبر آنے والے مہمان کو گھڑیلوں
پکارتے پکارتے اور چلاتے چلاتے اور کوڑا کھٹکھٹاتے اور زنجیریں
جاتے گزر جاتے ہیں اور جب ان تمام مشکلات کے بعد کوڑا کھلے اور
صاحب خانہ کو بھی بڑی بے لطفی اور تکلیف کے ساتھ جگایا گیا تو اب
خیال کر لینا چاہیے کہ اُس غریب پر اُس وقت کیا گذرتی ہوگی۔ پھر کبھی
یہ ہوتا ہے کہ مکان مختصر ہے یا اُس میں پہلے سے اور مہمان فرولش ہیں

اور مکان میں زیادہ جگہ نہیں ہے یا صاحب خانہ کسی ایسی تشویش میں ہے کہ اُس کو اپنے مہمانوں سے باطمینان و خوشی ملنے کی فرصت نہیں ہے ان تمام باتوں کے لحاظ سے ضرور ہے کہ اپنے آنے سے قبل اپنے میزبان کو حتمی الامکان اطلاع دی جاوے اور نہایت صفائی قلب اور دوستی کی بات یہ ہے کہ اگر کسی وقت میزبان یہ اطلاع دے کہ مجھ کو ملنے کی فرصت نہیں ہے تو بغیر کسی ملال خاطر کے اپنے ارادہ کو ملتوی کرنا چاہیے میں نے بعض اوقات یہ بھی دیکھا ہے کہ ایسے میزبان نے اپنی تکلیف بچانے کے واسطے یا مہمان کے آرام کی نظر سے مہمان کو کسی اور مکان میں اتارا تو مہمان نے دل میں بہت ہی بُرا مانا حالانکہ میزبان کا یہ برتناؤ کسی طرح اعتراض کے لائق نہیں ہوتا بلکہ بڑی عمدہ بات خیال کی جاتی ہے۔

بعض لوگوں کا یہ خیال ہوگا کہ جن خرابیوں کا ذکر اس مضمون میں ہے وہ صرف اُس حالت سے متعلق ہیں جبکہ مہمان اور میزبان میں باہم نہایت دوستی نہ ہو مگر یہ خیال غلط ہے اس لیے کہ یہ ایسے امور ہیں جو بطور واقعات کے پیش آتے ہیں جن میں زیادہ دوستی ہونے یا نہ ہونے کو کچھ دخلت نہیں ہے۔

کبھی اس بے خبر آنے کا نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اصل مقصود فوت

ہو جاتا ہے جس سے ملنا مقصود ہوتا ہے وہ مکان پر نہیں ملتا اور زیادہ افسوس اُس وقت ہوتا ہے جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آج ہی یا ابھی آپ کے تشریف لانے سے تھوڑی ہی دیر بعد وہ فلاں مقام کو سوار ہو گئے اور تب حسرت کے ساتھ وہاں سے لوٹ جانا ہوتا ہے اور یہ ایک کافی سزا اپنے بلا اطلاع آنے کی اُس وقت آنے والے کو مل جاتی ہے۔

اس بے خبر آنے کے علاوہ چند اور خرابیاں بھی بیان کے لائق ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ بعض میزبانوں کے مزاج میں تکلف اس قدر ہوتا ہے کہ اُن کا مہمان بھی تنگ آ جاتا ہے ان تکلفات کی وجہ سے کھانا اکثر دیر میں ملتا ہے اور تکلیف ہوتی ہے اور میزبان کو بھی زیادہ عرصہ تک اپنے عزیز مہمان کا قیام ناگوار معلوم ہونے لگتا ہے اور اُس کے آنے کی وہ ساری خوشی اُس کی موجودگی ہی میں جاتی رہتی ہے۔

سعدی علیہ الرحمۃ کسی مقام پر اپنے ایک دوست کے ہاں مہمان ہوئے اُن کے دوست نے بہت اہتمام سے اُن کی مہانداری کی بہت تکلف کے کھانے پکوائے اور بڑی شان کے ساتھ دسترخوان چٹا کیا۔ شیخ نے جب یہ سامان دیکھے تو بے اختیار اُس کی زبان سے

یہ نکلا۔ ہائے دعوت شیراز۔ صاحب خانہ نے یہ سمجھا کہ دعوت کے اہتمام میں کچھ کمی رہی اس لیے اُس نے دوسرے تیسرے وقت میں پیش از پیش اہتمام کیا لیکن ہر مرتبہ شیخ نے وہی افسوس ظاہر کیا آخر جب شیخ نے دیکھا کہ اب میزبان کو بہت تکلیف ہوتی ہے تو اُس نے اپنی اقامت کو مختصر کیا اور میزبان کی خدمت ہوا۔ کچھ عرصہ بعد اُن کے اس میزبان کا گذر شیراز میں ہوا اور شیخ کے ہاں اُترا اور دل میں اس بات سے بہت خوش تھا کہ اب شیراز کی دعوتوں کے اہتمام دیکھنے میں آویں گے جب کھانے کا وقت آیا تو شیخ گھر میں گیا اور وہاں سے وہی روزمرہ کا سیدھا سا دھا کھانا لے آیا اور اپنے دوست کے سامنے رکھ دیا اور کہا کہ بسم اللہ کیجیے۔ اُس وقت شیخ کے دوست کو بہت ہی حیرت ہوئی اور اُس نے آہستہ آہستہ کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا اور کھانا شروع کر دیا۔ شیخ نے اُس کی حیرت کو دیکھ کر کھانا کھا چکنے بعد اُس سے کہا کہ اے دوست دعوت شیراز سے میرا یہی مطلب تھا۔ تم نے میرے واسطے بہت سارے تکلف کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگر میں زیادہ قیام کرتا تو تمکو سخت ناگوار گذرتا اور میری مہمانی خوشی کی جگہ ملال سے تبدیل ہو جاتی اسی لیے میں نے اُس وقت مجبور ہو کر اپنی مدت

اقامت کو مختصر کیا اور جس غرض سے میں وہاں گیا تھا وہ بھی پوری نہ ہوئی نہ میں اچھی طرح وہاں ٹھہر سکا نہ سیر کر سکا اور جلدی سے نصرت ہوا یہاں اب آپ جس قدر مدت تک چاہیں قیام کریں جتنے روز آپ رہیں گے میری خوشی بڑھتی جاوے گی۔

میرا مطلب اس حکایت سے یہ نہیں ہے کہ اپنے دوستوں کی مہمانی کے زمانہ میں اُن کی خوشی خاطر کے لیے مطلق توجہ نہ کی جاوے نہیں بلکہ میرا یہ مطلب ہے کہ جو کچھ کیا جائے ایسے اعتدال سے کیا جائے جو آئندہ بھد سکے اور مہمان کے قیام سے سوائے خوشی کے دوسری بات حاصل نہ ہو۔

ان تکلفات کے علاوہ ایک اور اہتمام بھی جو اکثر عمل میں آتا ہے مہمان اور میزبان دونوں کے لیے سخت تکلیف کا باعث ہوتا ہے اور وہ مہمان اور میزبان کا ساتھ کھانا کھانے پر اصرار کرنا ہے اگر اتفاق سے اُن میں سے کوئی باہر کو چلا گیا اور آنے میں دیر ہوئی تو دوسرے صاحب اُن کے منتظر رہتے ہیں اور کھانا نہیں کھاتے اور جب زیادہ دیر ہوتی ہے تو جی میں نہایت تنگ ہوتے ہیں۔ تلاش کے واسطے چاروں طرف کو آدمی دوڑائے جاتے ہیں اور جب بڑی سی دیر کے بعد دوسرے صاحب آئے تب کھانا

نصیب ہوتا ہے اگر اتفاق سے کسی صاحب خانہ نے بلا انتظار اپنے مہمان کے کھانا کھا لیا اور مہمان صاحب بعد کو آئے تو بہت کم مہمان اس مزاج کے ہوتے ہیں جو میزبان کے اس برتاؤ سے بُرا نہ مان جاتے ہوں۔ میں نے خود ایک دفعہ دیکھا ہے کہ ایک مہمان جو باہر کو گئے ہوئے تھے جب وہ ایک بجے تک بھی نہ آئے اور صاحب خانہ نے ظہر کی نماز بھی پڑھ لی تب مجبور ہو کر بلا انتظار مہمان کے کھانا کھا لیا اُس کے بعد مہمان صاحب سیر کر کے بھوکے پیاسے واپس تشریف لائے اور تھک کر بیٹھ گئے اور فرمائے لگے کہ آج تو مرے جس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ بھوک بھی اُن کو لگی ہوئی ہے اور کبوترے سے بھی ایسا ہی ظاہر ہوتا تھا لیکن جب اُنھوں نے یہ سنا کہ صاحب خانہ نے کھانا کھلنے میں میرا انتظار نہیں کیا تو نہایت ہی بُرا مانا یہاں تک کہ کھانا بھی نہ کھایا اور یہ عذر کر دیا کہ میں بھی کھانا کھا چکا ایک دوست مل گئے تھے اُنھوں نے بغیر کھانا کھلائے نہ اُٹھنے دیا۔ اب غور کرنا چاہیے کہ ان ماحولوں کا کیا نتیجہ ہوگا کیا اس مہمانی اور اس میزبانی سے کچھ محبت اور خوشی بڑھ سکتی ہے۔

ایک اور خراب طریقہ یہ ہے کہ مہمان کو کوئی موقع تخلیہ اور آرام کا نہیں ملتا اور یہ خرابی دو وجہ سے پیدا ہوتی ہے اول اس لیے کہ ہمارے

مکانات کا طرز خراب ہوتا ہے۔ دوم ملنے جلنے کا طرز بھی اچھا نہیں ہے۔ ہمارے مکانات اس طرح پر علیحدہ علیحدہ حصوں میں تقسیم نہیں ہوتے کہ ہر ایک شخص کے لیے بغیر اس کے کہ اوروں کو تکلیف ہو آرام کے ساتھ تخلیہ ممکن ہو ایک ہی کھلا ہوا مکان ہوتا ہے وہی اپنے بیٹھنے اٹھنے کا وہی مہمانوں کے قیام کا۔ اگر کوئی بیمار ہے تو اُسی مکان میں ہی چوتراہ کے تنچے نال بھیکا بھی اُسی کے سامنے چڑھا ہوا ہے۔ ایک طرف کو ملاں لڑکے بھی اُسی مکان میں پڑھا رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اور اس لیے صاحب خانہ مجبور ہوتا ہے اور اپنے مہمان کے لیے کوئی موقعہ تخلیہ کا آسانی سے موجود نہیں کر سکتا۔ اس خرابی کا دور کرنا بالکل غریب اور متوسط الحال شخصوں کے اختیار سے باہر ہے لیکن اُمراء کو اس طرف توجہ کرنا ضرور ہے چنانچہ بعض امراء اپنے نو تعمیر مکانوں میں اس قسم کی رعایتیں اب ملحوظ رکھتے ہیں یا ان کے متعدد مکانات ہوتے ہیں جن کی وجہ سے یہ دقتیں ان کو کمتر پیش آتی ہیں لیکن اکثر امراء کو اب تک بھی اس طرف توجہ نہیں ہے اور ان کی پچاس پچاس ہزار اور ایک ایک لاکھ روپیہ کی عمارتیں اب تک بھی اکثر اُسی پُرانے نقشہ پر بنائی جاتی ہیں جن میں نہ سردی کا آرام نہ گرمی کا نہ مہمان کے لیے کوئی تخلیہ ممکن نہ اپنے لیے پس اگر امراء اس طرف

نوچہ کریں تو آخر کار متوسط الحال شرفا رہی اُن کی پیروی کریں اور رفتہ رفتہ غریب بھی حتی الامکان اُنھیں کی تقلید کرنے میں سعی ہوں۔

ایک اور تکلیف مہمان اور میزبان کے طرز ملاقات سے پیدا ہوتی ہے جس وقت مہمان کسی اپنے دوست یا عزیز و قریب کے مکان پر وارد ہوا صاحب خانہ اور اُس کے اور عزیز واقارب اور دوست و آشنا سب اُس مہمان غریب کے گرد ہوئے اور گھڑیلوں اور گھنٹوں بلکہ پہروں اُس کے پاس بیٹھنا شروع کیا ایک صاحب اُٹھ کر تشریف لے گئے تو دو صاحب اور موجود ہوئے غرض ہر وقت یہ جلسہ اُس کے پاس رہنے لگا اب جتنا کوئی مہمان کسی کو عزیز ہوا اُسی قدر یہ اہتمام زیادہ ہوتا ہے اور زیادہ عزیز کی مٹی زیادہ خوار ہوتی ہے۔ بہت ہی کم ہم سے وال ایسے بے تکلف مہمان ہوتے ہیں جو اس جم غفیر کا کچھ ادب اور لحاظ نہیں کرتے اور اپنے آرام میں خلل نہیں ڈالتے اور میزبان بھی ایسے بہت کم ہیں جو اپنے مہمان کی نیکان راہ اور صعوبات سفر کے لحاظ سے اُس کے آرام و آسائش کا خیال کرتے ہوں اور بخوشی خاطر اُن کو ایسا موقع دیتے ہوں کہ جب تک وہ چاہیں آرام کریں اور خط و کتابت وغیرہ کا جو کچھ شغل وہ چاہیں

تخلیہ میں اطمینان کے ساتھ کر سکیں۔ ایک اور بڑی مشکل یہ ہے کہ مہمان بھی چونکہ ہماری ہی جنس سے ہوتے ہیں اور اسی قسم کے تپاک اور طرز ملاقات کے عادی ہوتے ہیں اس لیے ایسا بھی اکثر ہوتا ہے کہ اگر کوئی میزبان یا میزبان کا کوئی عزیز و قریب اپنے مہمان کے پاس زیادہ حاضر نہ رہے تو مہمان صاحب بھی بُرا مان جاتے ہیں اور حماقت سے یہ سمجھ کر کہ ہماری کچھ قدر و منزلت نہ ہوئی خود اپنی نظروں میں حقیر اور تھوڑے تھوڑے ہونے لگتے ہیں اس لیے صاحب خانہ اپنے مہمان کے سر پر ہر وقت ایک باب باب کرنے والا پرہ متعین کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اب دیکھنا چاہیے کہ یہ کیسی کچھ دقت اور تکلیف کی بات ہے اور چونکہ ہم خواہ بہ حیثیت مہمان اور خواہ بہ حیثیت میزبان اس قسم کی تکلیفیں جھیلنے کے عادی ہو رہے ہیں اور اپنے بیش بہا وقت کو رانگیاں کھونے میں نہایت مشاق ہیں اس لیے یہ برتاؤ ہم کو کچھ زیادہ ناگوار نہیں گذرتا ورنہ وہ شخص جو اپنے وقت کی کچھ بھی حفاظت کرتا ہو ایک دن کے واسطے بھی کبھی کسی کے ہاں اس طرح مہمان ہو کر یا کسی ایسے تانا شاہ کا میزبان ہو کر خوش نہیں رہ سکتا۔

مہمانی اور میزبانی کی ان تمام مذکورہ بالا مصیبتوں کے علاوہ اور بہت سی ایسی ہی یہودہ باتیں ہیں جو ہم لوگوں میں رائج ہیں اور جن کے بیان

کرنے کے واسطے ایک مستقل رسالہ مرتب ہونا چاہیے اس لئے میں اُن کی
 طویل طویل تفصیلات میں پڑنا ضروری نہیں سمجھتا اور میں خیال کرتا ہوں کہ اگر
 وہ بڑی بڑی خرابیاں جن کا میں نے اوپر ذکر کیا رُفع ہو جاویں تو اور
 چھوٹی چھوٹی خرابیاں بھی جو اُنھیں بڑی خرابیوں سے پیدا ہوتی ہیں خود
 بخود رُفع ہو جاویں گی لیکن ختم مضمون پر اُس تازہ مصیبت کا تذکرہ البتہ
 مناسب ہے جو مہمان کو رخصت کے وقت فرمان واجب الاذعان آمدن
 بہ ارادت و رفتن بہ اجازت سے پیش آتی ہے۔

مہمان نے اب ڈرتے ڈرتے اور نگاہیں پچی کر کے صاحب خانہ
 سے رخصت ہونے کی اجازت چاہی مگر صاحب خانہ نے صاف انکار
 کیا۔ مہمان ہر چند منت کرتا ہے اور اپنی سخت سخت ضرورتیں بیان کرتا
 ہے لیکن صاحب خانہ راضی نہیں ہوتے اُس مجلس میں اور حنفیہ صاحب موجود
 ہوتے ہیں وہ بھی اپنا فرض ہی سمجھتے ہیں کہ صاحب خانہ کی تائید کریں وہ بھی
 مہمان کو قیام کرنے پر مجبور کرتے ہیں اور اُس بے کسی کے گھنٹے میں ایک
 تنفس بھی ایسا دکھلائی نہیں دیتا جو خدا لگتی ہوئی کئے اور مہمان کی بے کسی
 پر بھی رحم کرے کوئی صاحب فرماتے ہیں کہ ابھی آپ کہاں جاویں گے کوئی
 فرماتے ہیں کہ غاں صاحب کا کہنا پیچھے نہ ڈالیے غاں صاحب خوف رخصت
 سے جدایتوری چڑھائے ہوئے فرماتے ہیں کہ کبھی نہ کبھی تو آپ تشریف

لائے اور آتے ہی جانے کی سُنائی آپ کے اس آنے سے نہ آنا
 بہتر تھا دنیا کے کام چلے ہی جاتے ہیں یہاں آپ کب کب آتے ہیں۔
 المختصر یہاں تک اُس مہمان کو تنگ کیا جاتا ہے کہ وہ سخت رنج میں مبتلا
 ہو جاتا ہے اور اپنے دل میں کہتا ہے کہ اُسی میں کس عذاب میں آگیا اور
 کیونکر اس سے نجات ہوگی اور اپنے آنے پر نہایت افسوس کرتا ہے اور
 قہر و عیش و رجاں و روشش ایک دو مقام کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ پھر
 کیا یہ قیام فریقین میں کچھ محبت اور خوشی کو بڑھا سکتا ہو۔ نہیں ہرگز نہیں
 بڑھا سکتا بلکہ بعکس اُس کے دلوں کو بخیدہ کر دیتا ہے۔

اگر کوئی سخت بے حیا مہمان ہوا اور اُس نے نالائقی سے اپنے شفیعین
 میزبان کے اصرار پر کچھ خیال نہ کیا اور سمجھانے والوں کی بات بھی نہ مانی اور
 چلنے کا مصمم ارادہ کر لیا تو اب یہ جنجال کسی طرح اُس کا بچھا نہیں چھوڑتا کہ کھانا کھا کر
 جانا ہوگا اور یہ اصرار خاص کر اُن مقامات میں مہمانوں کو مصیبت میں مبتلا کرتا
 ہے جہاں ریل کے اسٹیشن قریب ہیں اور مسافروں کو ریل کے ذریعہ
 سے سفر منظور ہوتا ہے اکثر یہ ہوتا ہے کہ اثنائے سفر میں کوئی دوست اپنے
 دوست سے ملنے کے واسطے جو کسی اسٹیشن سے قریب ہوتا ہے اُترا
 اور یہ ارادہ کر لیا کہ دوسرے وقت کی ریل میں چلا جاؤں گا ایسے مسافروں
 سے بھی جب وہی معمولی تکلف آمیز جھگڑے اور قصے پیش آتے ہیں تو

اُن کو سخت حیرانی ہوتی ہے۔

اُدھر ریل کے وقت میں صرف ایک گھنٹہ یا ڈیڑھ گھنٹہ باقی ہے یہاں صاحب خانہ کے ہاں نوکر بازار سے گوشت لیکر بھی نہیں لوٹا مہمان کتنا ہے کہ برائے خدا مجھ کو رخصت کیجیے لیکن صاحب خانہ اس میں اپنی نہایت ذلت سمجھتے ہیں کہ بغیر کھانا کھائے یا کھانا ساتھ لیے مہمان گھر سے رخصت ہو۔ اب نوکر بھی بازار سے آگیا اور ریل کا وقت بھی بہت نزدیک پہنچا اور مہمان پر ایک سخت اضطراب کی حالت طاری ہوئی کبھی وہ اپنے اس خوف کو کہ ریل چلی جاوے گی اور میں رہ جاؤں گا شرم سے ضبط کر کر چڑکا ہوا اور کچھ دیر کے بعد گھبرا دیا اور کسی دفعہ چلنے کے قصد سے اُٹھنا چاہا مگر صاحب خانہ نے نہ اُٹھنے دیا آخر جب وقت بہت ہی نزدیک آگیا اور صاحب خانہ کو بھی کچھ ندامت سی ہوئی تو وہ بھی جلدی سے اُٹھے نوکر بازار کو پھر بھاگا کچھ مٹھائی بازار سے آئی کچھ آدھا کچا آدھا پکا کھانا میزبان صاحب گھر میں سے لائے اور بہزار سرعت و شتابی مہمان نے اس پانچ لقمے کھائے اور تھوڑا سا کھا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ میزبان صاحب اب بھی مصر ہوئے کہ آپ نے کچھ نہ کھایا اور کھائیے عرض جس طرح سے ہوا وہ کجخت مہمان صاحب خانہ سے رخصت ہوا سڑک پر دوڑ کر خدمتگار نے پان دیا اب مہمان صاحب بے گام بھاگ اسٹیشن کو چلے راستہ میں ریل کی آواز سنائی دی اور

بھی اوسان خطا ہوئے گاڑی والے سے تقاضا ہوا کہ جلدی چلو اور کچھ دور پہنچ کر انعام کا بھی وعدہ کیا گیا اس نے بھی بے تحاشہ گاڑی دوڑائی اور ریل چھوٹنے سے پہلے اسٹیشن پر پہنچا دیا اور کرایہ اور انعام لیکر علیحدہ ہوا اسٹیشن کے مزدور چلائے کہ پہلی گھنٹی ہو چکی ہے جلدی چلو ٹکٹ گھر میں پہنچ کر جلدی سے ٹکٹ لیا اتنے میں دوسری گھنٹی بھی ہوئی میاں اور مزدور دوڑے جب ہی اسٹیشن کے اندر کے چوڑے پر آئے تیسری گھنٹی ہوئی سیٹی بجی اور ریل نے آہستہ آہستہ آگے کو بڑھنا شروع کیا اب مہمان کجنت حیران کھڑا ہو اور حسرت کے ساتھ ٹرین کی اس نرم نرم رفتار کو دیکھ رہا ہے اسباب والے مزدوروں نے سمجھا یا کہ میاں آپ ہی نے ویر کر دی جانا تھا تو گھڑی بھر پہلے سے آئے ہوتے اب چلو دوسرے وقت کی ریل پر جانا یہ سنکر مہمان غریب لوٹا اور پھر گاڑی کرایہ کر کے میزبان صاحب کے مکان پر آیا۔ راستہ میں سو سو طرح کے غمگین خیالات نے اس کو رنجیدہ کیا جب مہمان صاحب مکان پر آئے تو میزبان صاحب دور سے دیکھتے ہی بے اختیار ہنس پڑے اور فرمانے لگے کہ کیسے ریل پر ہو آئے آپ نے تو کمال کر دیا تھوڑی ہی دیر میں پہنچ بھی گئے اور چلے بھی آئے ہم تو پہلے ہی کہتے تھے کہ آج نہ جاؤ ہمارا کہنا نہ مانا یہ اس کی سزا ہو۔

اب ہم اپنے اپنا بے جنس سے اس طلق مہمانی اور میزبانی پر انصاف

چاہتے ہیں اور دریافت کرتے ہیں کہ آیا یہ طریقہ تبدیل اور ترمیم کے لائق ہے یا نہیں کیا ایسے برتاؤ کی حالت میں کوئی مہمان خوشی سے کسی اپنے دوست کے پاس آنے کا ارادہ کرے گا۔ یہ کون سی آدمیت ہو کہ اپنے عزیز مہمان کی تمام ضرورتوں کی طرف سے آنکھیں بند کر کر قیام پر جا بلا نہ اصرار کیا جاوے ایسی مصیبت کی حالت میں سفر کرنے والوں کو انواع و اقسام کی تکلیف ہوتی ہے وہ اپنے کوچ و مقام کا کوئی انتظام اپنے اختیار سے نہیں کر سکتے نہ اپنے وقتوں کی تقسیم پر قادر ہو سکتے ہیں اور اس کے علاوہ بہت سے ہرج اور نقصان جو اس قسم کی مزاحمت سے پیدا ہوتے ہیں اور ہو سکتے ہیں ان کی وجہ سے بجائے ملاقاتوں کی خوشی کے ایک قسم کا ملال اور رنج پیدا ہو جاتا ہے پس ہماری خواہش یہ ہو کہ ہمارے اس مضمون کے پڑھنے والے ہمارے اس مضمون پر انصاف سے غور کریں اور جو رسم و رواج اصلاح کے قابل ہیں اس میں مناسب اصلاح کریں تاکہ مہمانی اور میزبانی کی خوشیاں اور زیادہ ہوں اور مہمان یا میزبان کسی کو تکلیف نہ دے اور وہ اصلاحیں جیسا ہم نے اوپر مفصل بیان کیا ہے مفصلہ ذیل مراتب میں ہونا چاہیے۔

اول۔ حق الامکان بلا اطلاع کسی کے ہاں آنے سے احتراز کرنا چاہیے گو باہم کیسی ہی بے تکلفی اور یگانگت ہو جہاں تک ممکن ہو اس قدر پہلے اطلاع دی جاوے

کہ جواب بھی آسکے ورنہ کم سے کم ایک دن پہلے میزبان کو اطلاع ہو جاوے
اگر بدرجہ مجبوری یہ بھی نہ ہو سکے تو رات کے وقت حتی الوسع کسی کے مکان
میں پہنچنے سے کنارہ کیا جاوے مگر جب ایسی کوئی سخت ضرورت پیش
آ جاوے۔

دوم۔ دعوت میں اس قدر تکلف نہ کرنا چاہیے جس سے اپنے عزیز مہمان
کا قیام آخر کار ناگوار معلوم ہونے لگے بچ بچ کی چال ہمیشہ بہتر ہوتی ہے
وخیر الامور اوسطها۔

سوم۔ یہ خیال بھی کہ میزبان و مہمان عموماً ساتھ ہی کھانا کھاویں ترک کرنا
چاہیے کھانے کے معمولی وقت پر اگر کوئی فریق غیر حاضر ہو تو اس کی حاضری
کا انتظار نہ کیا جاوے اور فریق غیر حاضر کو دوسرے فریق کی اس کارروائی
سے آزدہ نہ ہونا چاہیے۔

چہارم۔ تخلیہ کے موقع کا بھی جہاں تاک ممکن ہو خیال رکھنا چاہیے تاکہ مہمان
اور میزبان دونوں کو آرام ہو ہر وقت کے پاس اُٹھنے اور بیٹھنے سے تکلیف
بھی ہوتی ہے اور ملاقاتوں سے بھی جی گھبرا جاتا ہے۔ اور امر اطرز عمار
کا بھی خیال کریں۔

پنجم۔ آمدن بہ ارادت و رفتن بہ اجازت کے غلط اصول کو بھی منسوخ
کرنا چاہیے اور دونوں باتیں آنے والے ہی کی مرضی پر منحصر کرنی چاہئیں

تاکہ ہر شخص اپنے کوچ و مقام کا انتظام ٹھیک ٹھیک کر سکے۔

(از تہذیب الاخلاق حصہ ۴)



دوستی کا برتاؤ

(از انجیل سیٹھ محمد محمود سوم)

تہذیب الاخلاق کے نمبر اول جلد دوم میں ہم ایک مضمون دوستی پر لکھ چکے ہیں اُس میں ہم نے صرف اصول اور فوائد دوستی پر بحث کی تھی اس مضمون میں دوستی کے برتاؤ کی نسبت اپنے خیالات ظاہر کرنے منظور ہیں۔

سب اس بات کو مانتے آئے ہیں کہ دوستی انسان کی راحت کو دوچند اور مصیبت کو نصف کر دیتی ہے یعنی ہماری خوشی میں دوست بھی ہمارے ساتھ خوش ہو کر اُس خوشی کو دوچند کر دیتا ہے اور غمی میں دوست کی ہمدردی سے رنج کا آدھا بوجھ ہم پر سے ٹل جاتا ہے اگرچہ یہ قول بالکل سچائی پر مبنی ہے مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ بہت سے دوست رکھنے بہتر ہیں۔ عقلاً و متقدمین میں سے ایک کا قول ہے کہ بہت سے

ہوا خواہ بنا مگر دوست بہت کم۔ سب کے ساتھ امن سے رہ مگر ہزار میں سے ایک کو اپنا صلاح کار بننا، یعنی دوستی کم آدمیوں سے کر اور کسی کو دشمن نہ بنا کیونکہ دوستی کا بنا ہنا مشکل ہے دوستوں کی تعداد کے ساتھ ہماری مشکل بڑھتی جاتی ہے اور دشمن سے اپنے تئیں محفوظ رکھنے میں ہمیشہ وقت ہوتی ہے بگڑے ہوئے دوست سے زیادہ کوئی خطرناک دشمن نہیں وہ ہمارے عیوب اور بھیدوں سے واقف ہوتا ہے اور ہزار ہا ایسی مضرتیں پہنچا سکتا ہے جو کہ ناواقف دشمن کے اختیار میں نہیں ہو سکتیں۔

سب سے آسان دوستی وہ ہے جس کا ہم نے اپنے مضمون سابق میں اول ذکر کیا تھا یعنی وہ جو کہ بغیر آپس کی شناسائی کے ہوتی ہے ایسی محبت میں ہمیشہ ہموار اختیار رہتا ہے کہ کس قدر دوستی لکھیں اور اُس کے بالکل موقوف کرنے میں کچھ اندیشہ نہیں ہوتا کیونکہ اُس حالت میں کوئی اپنا دشمن نہیں بنتا مگر یہ دوستی ادنیٰ قسم کی دوستیوں میں شمار ہوتی ہے اور چونکہ جتنی دوستی کی مقدار قلیل ہوتی ہے اُسی قدر اُس سے خطا اور فائدے بھی کم حاصل ہوتے ہیں پس صرف اسی دوستی پر فضاہت کرنی نہ چاہیے۔

البتہ دوسری قسم کی دوستی جس کا اب ہم ذکر کرتے ہیں سب سے

زیادہ کارآمد ہے اور عام برتاؤ میں آتی ہے یعنی وہ محبت و الفت جو کہ بسبب ربط و ارتباط کے پیدا ہوتی ہے اور جس سے صحبت کی خوشی اور اصلاح کی دوستی ترتیب ہے سب سے مقدم شرط اس دوستی کی یہ ہے کہ دونوں شخص اپنے مرتبہ دنیوی کو بھول جاویں اور گواہ ایک دوسرے سے دولت و منزلت میں بدرجہا بڑھ کر ہو اپنی حالت دوستی میں ایک دوسرے کو برابر سمجھے بعد اس شرط کے ثابت قدمی اور صداقت طینت ہے یعنی تلون مزاجی اور بد باطنی دونوں میں نہ ہو۔ ایسے دو شخصوں میں کامل دوستی نہیں ہوتی جن میں سے ایک اپنے نہیں دوسرے سے اعلیٰ سمجھے یا جو کہ ثابت قدم اور صاف باطن نہ ہو لیکن بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جو دوستی میں اپنے رتبہ کو خیال میں نہ رکھیں اور یہ ہی مقدم باعث ہے کہ مختلف درجہ کے آدمیوں میں دوستی کا ہونا ناشائذ و ناوار ہے۔

ہم یہ پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ سچے دوست سے بڑھ کر دنیا میں کوئی دولت نہیں وہ رنج و خوشی میں یکساں ہماری ہمدردی کرتا ہے مگر ہکو اُس سخت عیب کا ذکر نہ بھولنا چاہیے جو کہ دوستی کے ایک بڑے خط کو خراب کر دیتا ہے ہماری مراد اُس یہودہ مشغلے سے ہے جس کو دل لگی یا ہنسی یا مزاح کہتے ہیں ہم ہنسی یا مزاح کے فی نفسہ دشمن نہیں بلکہ ضرور

کہ جب دو دوست بالکل گھل مل جاویں تو آپس اپنی خوشی کے لیے کچھ ہنسی کی باتیں کریں مگر ہم اس طرز ہنسی کے برخلاف ہیں جس سے اکثر محبت میں فرق آتا ہے۔ یہ وہ طریقہ مزاح کا ہے جس سے دوست کو بجائے خوش کرنے کے رنج دینا ہے یعنی اپنے دوست کی کسی سچ بات سے ہنسی کرنی مثلاً ہمارے دوست میں ایک عیب ظاہری ہو۔ اب ہنسی میں اس عیب کی طرف کسی قسم کا اشارہ کرنا گویا اس کے بُرے ہونے کو جانا ہے اور یہ بالکل نامناسب ہے کیونکہ وہ ہنسی ہنسی نہیں جو کہ سچ ہو بلکہ ایک نوع کی گالی ہے اور اپنے دوست کی ہجو اور اہانت کر کے اس کو رنج دینا ہوتا ہے۔

علاوہ اس طرز ہنسی کے آج کل ایک اور طرز دوستی کا یعنی آپس میں گالم گلوچ کا ہونا کمال محبت سمجھی جاتی ہے اس جگہ اس کی مذمت کرنی ہم ضرور نہیں سمجھتے کیونکہ ایسی بحث زیادہ تر اس موقع پر چسپاں ہوگی جہاں کہ شریف شخص کی تہذیب کا ذکر ہو۔

ایسے بھی لوگ ہیں جو کہ نہایت مختصر عرصہ میں بڑی دوستی کا دعویٰ کرنے لگتے ہیں اور گودل میں محبت نام کو بھی نہ ہو مگر ہمارے ساتھ ہر قسم کی ہنسی کا اپنے تئیں مجاز سمجھتے ہیں۔ اکثر ایسے ہی لوگ رنج دل میں ڈالنے والی ہنسی کے بہت شوقین ہوتے ہیں اور خود یہودہ خوشی حاصل

کرتے ہیں مگر اس سے بھی بدتر ایک اور کمینہ عادت ہے کہ ہنسی کے پردہ میں کسی کو طعنہ دینا یا ایسی بات اسرار تائیں جو کہ حقیقت میں اُن کو کمینہ منظور تھی مگر اپنی بباطنی کے سبب صاف نہ کہہ سکتے تھے یہ بات ذرا غور سے سمجھ میں آوے گی اگرچہ ہر شخص کو اپنی زندگی میں ایسے لوگوں سے پالا پڑتا ہے۔

اصل ہنسی وہ ہر جو کہ ایسی بات کی نسبت جو ہمارے دوست کا عیب نہیں یا جس کے ذکر سے اس کو رنج نہ ہو۔ ایک قسم کی بات گڑھنے سے اگر ہمارے دوست کو کچھ بھنڈا ہٹ آوے تو وہ غصہ ہرگز مؤثر نہیں ہوتا اور نہ اُس سے کچھ ہرج ہو بلکہ تھوڑے عرصہ کے بعد سب کو اُس سے خوشی ہوتی ہے خود اُس دوست کو جس کی کہ ہنسی کی گئی تھی لطف آتا ہے ہلکویہ بھی بیان کرنا ضرور ہے کہ ہنسی میں کوئی جھوٹ بات بیان کرنی جایز نہیں سوائے اُس کے جس کی غلطی مرتج ہو۔ ایسا جھوٹ جھوٹ نہیں کیونکہ وہ اپنے جھوٹ ہونے کو خود صاف دکھاتا ہے اور اُس سے کسی قسم کا ہرج نہیں ہوتا۔

ایک اور بات پر غور کرنا چاہیے۔ یہ مقولہ سب دوستوں میں مشہور ہے کہ دوست کا مال اپنا ہی ہوتا ہے۔ یہ نہایت اعلیٰ اور عمدہ قول ہے مگر انوس کی بات ہے کہ اس کا بھی برتاؤ بُری طرح پر ہوتا ہے اکثر یہ

معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص اس سبب سے کوئی اچھی شے نہیں رکھتا کہ اُس کے ملاقاتی اُس کے پاس وہ شے نہیں رہنے دیتے ”دوست اچھی شے نہیں چھوڑتے“ یہ اکثر سننے میں آتا ہے۔ کوئی شے اس سے زیادہ شریف اور اعلیٰ نہیں کہ محبت میں اپنے اور اپنے دوست کے مال کو ایک سمجھے اور اپنی سب چیزوں کو گویا اُس کے لیے سمجھے مگر اس سے زیادہ کوئی حقیر بات نہیں کہ باوجودیکہ ہم کو معلوم ہے کہ ہمارے دوست کو ایک شے نہایت پسند ہو اور اس لیے اُس کو عزیز رکھتا ہے پھر بھی ہم اُس سے اُس شے کی درخواست کریں۔ غور کرنے کی بات ہے کہ اس کا اصول کس قدر غلط ہے اگر ہم اپنے دوست کی ایسی شے کو پسند کریں جس سے اُس کو کسی قسم کی آسائش یا خوشی ہو تو کس قدر محبت کے خلاف ہے کہ اُس سے وہ لیکر دوست کی خوشی یا آسائش میں خلل انداز ہوں اگر وہ شے ہماری دانست میں عمدہ ہے تو ہم کو چاہیے کہ یہ خواہش کریں کہ ہم سے پہلے ہمارا دوست اچھی شے رکھے اور خوشی اور آسائش حاصل کرے نہ یہ کہ اُس سے وہ لیکر محبت کے برخلاف بات کریں۔ باوجودیکہ ہماری دانست میں اپنا اور دوست کا مال ایک ہے لیکن تاہم اُس سے وہ چیزیں یعنی چاہئیں جو کہ ہماری ہی دانست میں عمدہ ہیں مگر اُس کو کچھ چنداں عزیز نہیں یا اُس حالت میں اُن کی درخواست کی جاوے جبکہ

ہم کو کچھ شک نہو کہ اُس خاص شے کے لینے سے ہم کو اپنے دوست کی آسائش سے (جو کہ اُس چیز خاص سے اُس کو ہوتی ہو) بدرجہا بڑھ کر ہوگی اکثر اس طرح بھی محبت میں فرق آتے دیکھا ہے کہ ایک شخص نے اپنے دوست سے ایک شے کی درخواست کی اور اُس نے انکار کیا تو ظاہر ہے کہ محبت میں فرق پڑا۔ سچی دوستی کو ایسی حالت میں یہ یقینی ہے کہ اگر درخواست کنندہ کو یہ معلوم نہ ہو کہ فلاں دوست کو نہایت عزیز ہے اور اس ناواقفیت کی حالت میں درخواست کرنے کو معلوم ہوتے ہی اپنی درخواست کو واپس کرے اور اُس شے کے لینے پر ضرر ہو۔ اس بات کو غور سے سمجھ لینا چاہیے کہ کسی شے کا جو کہ ہمارے دوست کے بہت مانگنا اُسی قدر محبت کے خلاف ہے جس قدر کہ اُس دوست کا اُس شے سے درخواست کے بعد نہ دینا۔ اگر کوئی وجہ خاص ایسی درخواست یا انکار کی ہو تو سچے دوستوں کو لازم ہے کہ ہمارے بیان کر دیں اور نہ یہ کہ جس میں نسل آئے ہیں۔

کیا اچھا قول ہے کہ دوست حقیقی ایک بہت مضبوط پناہ ہے اور جس نے ایسا دوست پایا تو باک بڑا خزانہ پایا چچا دوست زندگی کے امراض کی دوا ہے اور جو لوگ دل نہ رکھتے ہیں اپنی نیکی کے صلہ میں ایسا دوست پائیں گے، سب سے خوبصورت اور غور و تامل کے لائق اس معقولہ کا اجر حصہ ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ اپنی طبیعت کی نیکی اور دل کی صفائی کے

بغیر ہلکے سچا اور وفادار دوست نہیں ملتا۔

دل را بدل رہے ست دریں گنبدِ پہر

وہ شخص جو کہ خود صاف اور نیک ہے ضرور کبھی نہ کبھی اپنا سا دوست پاویگا اور گو اپنی صفائی کے سبب اُس کو کبھی بد لوگوں سے مضرت پہنچے مگر بلاشبہ سچے دوست کے ملنے سے محروم نہ رہے گا مگر بد باطن کو کبھی اچھا دوست نہیں نصیب ہوتا اگر اُسی کی سی خاصیت کا شخص ملا تو وہ اس کی نسبت اتنا ہی شبہ کریگا جتنا کہ یہ اُس کی نسبت اور کبھی کھل کر دوستی نہیں ہونے کی۔ اگر بد باطن شخص کسی صاف باطن سے ملے تو اُس کو اُس کی نسبت بھی اپنی بیچینی کے سبب شبہ رہے گا اُس بات کی فکر میں رہے گا کہ اُس کے بھید معلوم کروں اسی خواہش میں مبتلا ہو کر چھپ چھپ کر باتیں سُنے گا اور اگر اتفاقاً کوئی ایسی بات سُن پائی جو اُس کی دانست میں اُس کے برخلاف ہوئی تو اُس کو اپنی غیبت تصور کر کے اپنے دل میں اپنے تئیں مبارکباد دیکھا کہ کس ہوشیاری سے بھید معلوم کیا گو وہ بات جو کہ اُس نے چھپ کر سنی اور اس طرح پر بات سننے اور چوری میں کچھ فرق نہیں، ایسی ہو کہ اُس صاف باطن شخص کو اُس کے روبرو کہنے میں بھی کچھ تامل نہوتا ایسے شخص کو کبھی سچے دوست کی سی نعمت نصیب نہیں ہوتی تعجب نہیں کہ تھوڑے عرصہ تک صاف باطن اس بد باطن شخص کو اچھا اور صادق دوست سمجھے مگر نہایت جلد اُس کے حرکات

سے اُس کی خاصیت کھُل جاتی ہے اور صاف آدمی اپنی اس ملاقاتی سے
 شغفر ہو جاتا ہے۔

جبنا دوست پُرانا ہوتا جاتا ہے اتنی ہی قدر بڑھتی جاتی ہے اور
 گواکثر ہکونے دوست کی وفا پر اتنا ہی بھروسہ ہو جاتا ہے جتنا کہ پُرانے دوست
 پر مگر تاہم پُرانے دوست کے ساتھ زیادہ تجربہ زندگی کا ہوتا ہے اور اسی وجہ
 سے کہ وہ قدیم ہے اُس کی قدر زیادہ ہوتی ہے مگر گہری دوستی بڑے
 اندیشہ کی شے ہے اور اُس کے برقرار رکھنے کے لیے ہم کو بڑی احتیاط
 لازم ہے۔ ایک دفعہ دوستی ٹوٹنے کے بعد کو عقلمند اور عالی ہمت شخص اُس
 شخص کا جو کہ اُس کا دوست تھا قصور معاف کر دیگا مگر پھر دوستی کا ہونا
 مشکل ہے اور میری دانست میں اُس شخص سے جو کہ ہمارے ساتھ دوستی کا
 دعوے کر کے ہمارے ضرر کی بات دانستہ کرے دوستی پھر نہ کرنی چاہیے
 گو اُس کا قصور بالکل دل سے معاف کر دے اور صلح کر لے۔ اگر یہ معلوم ہو جاوے
 کہ وہ حرکت جس سے ہم نے ناراض ہو کر ملاقات ترک کی تھی حقیقت میں
 دشمنی کنی تھی تو پھر محبت کے جاری کرنے میں کچھ ہرج نہیں اور ایسی بات
 کو اگر کوئی شخص معاف نہ کرے تو وہ بہت بے رحم اور بے مروت سمجھا
 جانا چاہیے۔

ایک عقلمند کا مقولہ مشہور ہے کہ ”اپنے دشمنوں سے دور رہو اور دوستوں

سے ہوشیار، گو یہ قول ایک دانا شخص کا ہے مگر ہم اس کے اخیر حصہ سے متفق نہیں۔ وہ دوستی کیا جس میں کہ دوست پر کچھ بھروسہ نہ کیا جاوے اور وہ محبت کیا کہ جس میں اپنے دوست کی وفا پر شبہ رہے۔ شاید یہ قول دنیا کے کاروبار میں نہایت ٹھیک ہو مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ ہمارے خیالات دوستی کے قطعاً برخلاف ہے۔ اس مقولہ سے گویا یہ سکھانا ہے کہ دوست کو بھیدوں سے مطلع نہ کرے مگر ایسی حالت میں سب سے بڑا فائدہ دوستی کا جاتا رہتا ہے۔ وہ شخص نہایت نادان بلکہ خائن ہے جو کہ اپنے دوست کے بھیدوں سے دوسروں کو مطلع کرنا پھر ہم کو اختیار ہے کہ جس کو چاہیں اپنا راز دار بنا دیں مگر یہ بے شک امانت کے برخلاف ہے کہ اپنے دوست کے بھیدوں کو غیروں پر کھول دیں۔ الغرض اپنے دوست کی بڑی خاطر داری لازم ہے اور کوئی بات اُس کو رنج دینے والی نہ کرنی چاہیے۔ مصباح

دل ہی تو ہر نہ سنگ و خشت درو سے بھر نہ آئی کیوں

بڑے دوست کی ذرا سی محبت کے برخلاف بات سے بڑا رنج ہوتا ہے اور ایک ایسی دل شکنی کے بعد دوستی کا جاری رہنا دشوار ہے کیونکہ۔ دل راکش نہ کہ گوہر شکستہ۔

ہم نے اپنے مضمون سابق میں (جس کا یہ مضمون گویا تتمہ ہے) اُن

فوائد کا ذکر کیا تھا جو کہ ہمارے دوست سے ہم کو ہوتے ہیں یہ سب فائدے
 اکثر دوست کے اپنے بغیر کچھ تکلیف اٹھائے یا کچھ دولت صرف کیے نہیں
 ہوتے اور اس لیے اُن کے سبب ہم پُر اُس کا بڑا احسان ہوتا ہے ایسے احسان
 کے معاوضہ میں صرف اُس سے محبت زیادہ کرنی چاہیے اور مقولہ مشہور
 ”حساب دوستاں در دل“ نہایت غلطی پر مبنی ہے اگر اس مقولہ کے
 معنی یہ سمجھے جاویں کہ جب کوئی دوست ہمارے لیے اپنی کچھ دولت صرف
 کرے یا کسی اور طرح ہم کو ممنون کرے تو اُس کے احسان کو ہم اپنے دل میں
 رکھیں اور موقع پُر اُس کو اتار دیں۔ ہم اس بات کے بیان کرنے سے
 باز نہ رہیں گے کہ یہ معنی اس مقولہ کے ہماری رائے میں محض غلط ہیں۔
 جس وقت کہ ہم اس اصول کو قبول کر لیں تو ظاہر ہے کہ اپنے دوست کا احسان
 لینا گویا قرض لینا ہے اور ضرور ہے کہ ایسے احسان کا بوجھ اس قدر ناگوار ہوتا ہو
 کہ برداشت نہیں ہو سکتی قرض کو تو بوقت مفقود اتار بھی سکتے ہیں مگر ایسے
 احسان سے تو جان چھٹانی مشکل ہوتی ہے اس لیے بدلے اس کے کہ ضرورت کے
 وقت اپنے دوست کی سعی و کوشش کو کام میں لا دیں ایک خواہش اس کے
 برخلاف پیدا ہو جاتی ہے فی الحقیقت دوستی مثل بازار میں سود اخذ کرنے
 کے ہو جاتی ہے احسان لیا اور اتار دیا جیسے سود لیا اور دام ادا کیے۔ دوست
 کی دوستی سے کیا فائدہ اگر اُس کے احسان کو لیکر ہم اپنے پُر اُس کا اتارنا واجب

سمجھیں اور کیا یہ محبت کے برخلاف نہیں ہے کہ اُس کے احسان کو ہم اپنے
 برابر یا فرض سمجھیں ہاں یہ محبت کا مقتضی ہے کہ جہاں تک ہم سے ہو سکے
 اپنے دوست کی بہبودگی کے لیے کوشش کریں مگر اس سعی کو اس نیت سے
 کرنا کہ اُس کا احسان ہم پر سے ٹل جاوے بد باطنی میں داخل ہے۔ احسان
 ہم پر سے کبھی ٹل نہیں سکتا کیونکہ احسان کنندہ کو احسان کرتے وقت کچھ معاوضہ
 ملنے کی توقع نہیں ہوتی وہ صرف ازراہ محبت ایک کام ہمارے فائدہ کا کرتا
 ہے۔ اس سے ہم اُس کے ممنون ہوتے ہیں ایسا احسان صرف اس سبب
 سے کہ اول کیا گیا ہے بعد کے ہزار احسانوں سے بھی نہیں اُترتا بعض
 لوگ اس نیت سے احسان کسی پر کرتے ہیں کہ وہ شخص ہمیشہ اُن کا
 ممنون رہے ایسی حالت میں گو اُس شخص کو ہمیشہ احسان مندرہنا زیبا
 ہے مگر اُس احسان کی خود قدر گھٹ جاتی ہے ایسے ہی احسان کرنے
 والے بعد کو احسان جتا یا کرتے ہیں اور واقع میں احسان کر کے بھول جانا
 یا سوائے محبت کے اور کسی قسم کی عوض کی امید نہ رکھنا بہت عالی ہمت
 اور شریف لوگوں کا کام ہے۔

گو اوپر کے فقرہ میں دوست کے احسان اُتارنے کی خواہش کو
 ہم بُرا کہہ آئے ہیں مگر ہم اُس بد باطنی کی بھی مذمت کرتے ہیں جو کہ خواہش
 مذکورہ بالا کی ضد ہے یعنی اس بات کی خواہش رکھنا کہ جس دوست پر

ہم احسان کر چکے ہیں اُس کا احسان نہ لینا چاہیے تاکہ ہمارا احسان اُس پر سے اُتر نہ جاوے۔ جس شخص میں ایسی خواہش ہوتی ہے وہ کبھی سچا دوست نہیں ہوتا اور اُس کا احسان نہایت ناگوار گذرتا ہے کیا اُس نے ہلکوبے بس یا بے مقد و سمجھک احسان کیا تھا یا یہ کہ ہلکوفقیرو ذلیل اور اپنے تئیں امیر و کبیر اور ہم سے مرتبہ میں اعلیٰ سمجھتا ہے کہ ہم جو اُس کی خدمت محبت سے کرنی چاہتے ہیں اُس کے قبول کرنے میں اُس کو عار ہے ہاں اگر دوست کو تکلیف دینے میں ہلکوتا مل ہو تو یہ عین محبت ہے مگر اس غرض سے اُس سے کسی بات کی درخواست نہ کرنی یا اُس کی دولت کے نہایت قلیل حصہ کو بھی اپنے لیے صرف نہ ہونے دینا کہ ہم پر اُس کا احسان نہ ہونے پاوے یا یہ کہ ہمارا احسان اُس پر سے نہ اُتر جاوے بدباطنی اور نفاق میں داخل ہے۔

ایک اور بات کا ہم مختصر ذکر کرتے ہیں۔ زندگی کے تجربہ سے اکثر معلوم ہوا ہے کہ جب کبھی دوستوں میں لین دین شروع ہوا دوستی میں غالباً خلل واقع ہوتا ہے اس لیے ہماری دانست میں دوست کو ہمیشہ قرض حسنہ دے کہ اگر بالفرض وہ ادا نہ کر سکے تو محبت شکنی نہ ہو یہ بہتر ہے کہ اگر دوست قرض مانگے تو صاف بیان کر دے کہ مقدار خاص سے زیادہ وہ دے نہیں سکتا اور اگر ایسے انکار سے کوئی دوست ناراض

ہو تو اُس کا قصور ہے۔

ہم نے ایک بڑے شخص کے مُنہ سے یہ مقولہ سنا ہے کہ دوست را میاز ما، مگر اس کے معنی ہرگز یہ نہیں کہ اُس کے احسان لینے سے یا وقت ضرورت مدد کی درخواست کرنے سے عار رکھ بلکہ یہ معنی ہیں کہ بلا ضرورت صرف اپنے دوست کی وفا آزمائی کے واسطے اُس سے کوئی درخواست نہ کرنی چاہیے کیونکہ آزمانا صرف شبہ کی حالت میں ہوتا ہے اور وہ دوست صادق نہیں جو اپنے دوست کی وفا پر شبہ کرے۔ زمانہ خود ہر شخص کی خاصیت کو کھول دیتا ہے پھر ہم کیوں اپنے دوست کی نسبت بدگمانی کریں جب تک ممکن ہو اُس کو اپنا دوست سمجھیں اور اگر اخیر کو وہ بد باطن نکلے تو صرف خاموش اور غلغلہ ہو جاویں مگر اول ہی آدمی کے پہچاننے میں ہم کو احتیاط چاہیے تاکہ آخر کو ندامت نہ ہو۔
ع چرکارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی۔



محسنُ الملک مرحوم

(از مولوی عبدالحق صاحب بی اے - حیدر آباد دکن)

اگر غور سے دیکھا جائے تو انسان کا آنا اور جانا یعنی پیدا ہونا اور
مرنا دونوں ایک سے فعل ہیں۔ دونوں فعل اُس کے بس سے باہر
ہیں۔ نہ اپنی خوشی آتا ہے۔ نہ اپنی خوشی جاتا ہے۔ اور نہ معلوم
کہاں سے آتا ہے اور کہاں جاتا ہے۔ اور شاید جہاں سے آتا ہے
آخر وہیں چلا جاتا ہے۔ یہ اسرار ہیں اور اسرار رہیں گے۔ لیکن اتنا یقین
ہے کہ ان دو منزلوں کے درمیان جو وقفہ ہے اور جو گنتی کی چند
سائنس انسان کو عطا ہوئی ہیں وہی اس کی حیات ہی۔ وہی اس کا
سرمایہ۔ وہی اس کی دنیا اور وہی اس کی آخرت۔ اسی میں اس
کی زندگی ہے اور اسی میں اس کی نجات۔ اور اسی میں اس کی
موت ہی اور اسی میں اس کا عذاب۔ گویا یہ چند دن امتحان کے
ہیں اور دنیا دام ترغیب ہے۔ اس میں جو پورا اُترا اس نے حیات
جاودانی پائی اور جو رہ گیا سو رہ گیا۔

دنیا کی رونق اور ترقی انہیں نفوس کے دم سے ہے جو یہاں

کی کڑی کڑوی جھیل کر اور تھج در تھج تر غیبات کے پھندوں سے
 نکل کر امتحان میں پورے اُترتے ہیں۔ ان کی کمی سے دنیا کو زوال
 اور ان کی ترقی سے دنیا کو ترقی ہے۔ اسی طرح جس قوم میں ایسے لوگ
 پیدا نہیں ہوتے اور بہت کم ہوتے ہیں وہ معرض زوال میں ہی اور
 جہاں ان کا سلسلہ جاری ہے وہاں ترقی و اقبال شامل حال ہی۔
 ہماری قوم میں ایک مدت سے فطرت الرجال ہے۔ اور جو ایک آدمی
 خدا کا بندہ اس زمانہ میں پیدا ہوا تو ایسے وقت میں داغِ مفاقت
 دے کے چلا گیا جبکہ اس کی ضرورت اور بڑھ گئی تھی اور جبکہ اس کے
 افادہ کا دائرہ وسیع ہو گیا تھا۔ سرسید نے انشی برس کی عمر میں انتقال
 کیا۔ لیکن ہمارے حساب سے وہ بے وقت مرے۔ اب ان کے
 جانشین قوم کے سردار۔ ملک کے محسن۔ محسن الملک شہزاد کی عمر
 میں ہمیں چھوڑ گئے ہیں۔ مگر ہم یہی کہیں گے کہ یہ موت بھی بے وقت
 ہوئی۔ اس لیے کہ جو کام محسن الملک کر رہے تھے وہ جوانوں سے بھی
 نہوسکا۔ اُس ایک اکیلے بڑھے کا کام اتنا بڑا تھا جس سے ہزار دو ہزار
 نہیں بلکہ لاکھوں کے منہ پھر گئے۔ اور اگر سچ پوچھو تو اُس نے ایسے وقت
 جبکہ خانہ قوم کی بنیاد متزلزل ہو رہی تھی اور مسلمانوں کی آنکھیں آسمان
 کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ دل دھڑک رہا تھا۔ وہ کام کیا جو چھ کڑوڑ

نفوس سے نہوسکا۔ اس کی مردانہ ہمت اور اس کی مصلحت اندیشی ہمارے
 قوم میں یاد رہے گی۔ اس نے بقول حالی سرسید کے مشن کو اس
 طرح پورا کیا جس طرح پال نے مسیح کے مشن کو پورا کیا۔ اس نے اپنے
 ہادی کے مرنے پر صلیب کندھے پر اٹھائی اور بزرگ سید کے قدم
 بقدم چلکرا اور ساری آفات سہکرا آخر بیڑے کو کنارے پر جا لگایا جو ناخدا
 کے چل بسے سے بھنور میں پھنس گیا تھا۔

میرے خیال میں ایک بڑے شخص کی سب سے بڑی علامت
 یہ ہے کہ جب تک وہ زندہ ہے اور اپنے کام پر ہے دوسرے شخص
 کی ضرورت محسوس نہو۔ اور اُس کے سوا کسی دوسرے پر نظر نہ پڑے
 یہی حال مرحوم کا تھا۔ جب تک اس کے دم میں دم رہا ساری قوم
 نے اسے بالاتفاق اپنا سردار تسلیم کیا۔ اور جس کام میں اس نے
 ہاتھ ڈالا اُسے اس خوبی اور سہولت اور کمال سے ادا کیا کہ سب کو
 یقین ہو گیا کہ اس سے بہتر دوسرا شخص نہیں کر سکتا۔

یہ بڑے شخص کے پہچاننے کی علامت ہے۔ لیکن بڑا شخص حقیقت

کون ہے؟ ہم بڑا شخص اسے کہیں گے جو ایثار کو کام فرماتا ہے۔ جو اپنے
 اغراض اور خواہشات پر لات مار کر دوسروں کی دست گیری کرتا ہے۔
 جس طرح خود غرضی انسان کی سب کی مذموم صفت ہے اسی طرح ایثار

اس کا اعلیٰ وصف ہے۔ بلکہ سب سے بڑی نیکی سب سے بڑی عبادت ہے۔ بھلا کون کہہ سکتا ہے کہ مرحوم میں یہ صفت نہ تھی؟ اس کے کارنامے۔ اس کی جاں فشائیاں اور اس کی سحر کاریاں ایک عالم پر روشن ہیں۔ اس نے ہمیشہ ایثار اور احسان سے کام لیا اور خاص کر اس کی زندگی کا آخری حصہ ایسے نیک اور اعلیٰ کاموں سے مملو تھا۔ کہ اگر اس کا صرف ایک ایک کام ایک شخص کو تفہیم کر دیا جاوے تو ان میں سے ہر ایک بڑا شخص کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے۔ وہ جامع حیثیات تھا اور اس نے ہر حیثیت کو بدرجہ اتم نبایا۔ وہ ملک کا دوست اور قوم کا عاشق تھا اور اس نے اپنی دوستی کا حق ادا کر دیا اس کی زندگی کی ایک ایک گھڑی اور ایک ایک لمحہ دوسروں کے لیے وقف تھا۔ وہ جب تک جیا اسی دُھن میں جیا۔ اور جب مرا تو اسی دُھن میں مرا اور رتبہ شہادت پایا۔ یہ لوگ بڑے لوگ ہیں۔ ان کے رتبے بہت اونچے ہیں۔ یہ شاہ راہ عالم کے رہنما پتھر ہیں۔ جب تک زندہ تھے لوگوں کی رہبری کرتے رہے۔ اب مرنے کے بعد بھی دوسروں کی رہنمائی کریں گے۔ وہ مرے نہیں۔ جیتے ہیں۔ مگر اس طرح نہیں جیسے ہم جیتے ہیں۔ بلکہ اُن کی حیات حیاتِ ابدی ہے اور ان کی زندگی زندگیِ جاوید۔

اس میں شک نہیں کہ بولتی چالنی تصویر ہماری آنکھوں سے نہال ہوگئی۔ وہ ہاتھ جس کے اٹھنے سے ہماری امیڈیں اٹھتی تھیں اٹھنے کے قابل نہیں رہا۔ وہ دماغ جو آڑے وقت پر ہمارے مشکلات کی گتھیوں کو آناً فاناً میں سلجھا دیتا تھا کام سے عاجز رہ گیا۔ اور وہ زبان جسکی جادو بھری تقریر سے مجمع کے مجمع دم بخود رہ جاتے تھے خاموش ہوگئی ہے لیکن اس کے کام ہمارے ساتھ ہیں۔ اس کے نقش قدم اُبھرے ہوئے ہیں اور نقش فی الحجر ہیں۔ سید مرگیا مگر وہ اب تک ہمارے ساتھ ہے اس کا نام اُس سے زیادہ روشن اور اس کا کام اس سے زیادہ اُجاگر ہے۔ ہم جب کبھی کوئی قومی کام کرنے کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں بلکہ حقیقت میں محسوس کرتے ہیں کہ اس میں سید کا ہاتھ ہے۔ اب مہدی علی چل بسا۔ لیکن وہ اب بھی محسن الملک ہے۔ ان کی زندگی سے سبق سیکھو۔ اُن سے زندگی بسر کرنا سیکھو۔ ہزار کالج و یونیورسٹی سے بڑھکر یہ معلّم ہیں۔ وہاں علم ہے مگر بے مزہ اور بے نمک۔ اور یہاں اس عمل کا علم ہے جس میں اسرار حیات ہویدا ہوتے ہیں۔ اور جس پر ہزار وار العلوم قربان ہیں۔ وہ بے جان ہے۔ اور یہ جاندار ہے۔ وہ جگ بیتی ہے اور یہ آپ بیتی ہے۔ اور اسی لیے یہ زیادہ کارآمد اور زیادہ پُراثر ہے۔ غرض زندگی ان لوگوں کی اور

مرنا ان لوگوں کا بقول حالی عیوں تر ہیں یوں جیتے ہیں سوتے ہیں۔
 اے کالج کی مبارک زمین مسجد! دیکھ آج قوم کا جگر گوشہ اپنی زندگی کے
 مرحلے طے کر کے تجھ میں پناہ لیتا ہے۔ دیکھ تیرے پاس ہماری قوم کے دو محلے بے بہا
 اور بھی مدفون ہیں۔ آج ایک قیسراگو ہر شب چراغ اور آتا ہے۔ یہ آسمان
 خفتہ بخت حراماں نصیب قوم کی تین عزیزا مانیتیں ہیں جو تجھے داؤدِ حشر
 کے سامنے پیش کرنی ہونگی۔ یہ ہماری آنکھوں کے تارے تھے جو آج تجھ
 میں مدفون ہیں۔ لیکن یہ غروب ہو کر بھی اپنی روشنی چھوڑ گئے ہیں
 اور حشر میں پھر چمکیں گے۔ اے روشنی! جا۔ اے قوم کے تارے جا اور
 وہاں جا کے سو جا۔ جہاں قوم کے آفتاب اور ماہتاب پڑے سو رہے
 ہیں۔ شامِ ظلمت آپہنچی ہے۔ تاریکی چھا رہی ہے۔ اب اور تارے
 نکلیں۔ گم تیری چمک کسی میں نہو گی۔ جا اب عالم بقا میں جا۔ تیرا
 آنا مبارک ہوا۔ خدا تیرا جانا بھی مبارک کرے۔ تجھے تاقیامت
 خدا کی رحمتیں نازل رہیں۔



شاعری

(از محمد رفیع دیوانہ)

گلشنِ شاعری کی بہار دید کی متقاضی ہے۔ ہر گل اپنے حسن پر پھولا ہے۔ اور
اپنی دلفریبی پر پھولا۔ غنچوں کا تبسم مجازاً اُن کی حقیقت پر شاہد ہے۔ ڈالیوں
کی لچک سے یہ رونق دہنی ہو گئی ہے۔ مگر سادگی پسند طبیعتیں سبرے کے
نظارے میں محو ہیں اور عاشقِ مزاج دلِ نالہ قمری اور فغانِ بلبلِ سُن سُن کر سرد
ہیں۔ جرات ہوتی ہے کہ زمین کس قدر زرخیز ہے جہاں طبیعت اور مزاج کے مذا
کے موافق دلچسپیاں موجود ہیں۔ یہاں پر حکیم افلاطون پر افسوس آتا ہے جنھیں اس
کی کوئی ادانہ بھائی۔ اور شاعر وجودِ محفلِ نظر آئے ورنہ مبدِ رفیض نے اس کی آبیاری
کے لیے ایسا ایسا سامان مہیا کر رکھا ہے کہ کبھی یہ ہر ابھر اچھن خشک نہوگا۔ پھر
پھولوں کی ہلک۔ شاخوں کی لچک۔ طائرانِ خوش الحان کی چمک۔ تعجب
ہے جو کسی دل کو نلے لہجائے رہیں۔ قوتِ تخیلہ (ایمی جینشن) اس باغ
کی وہ باغبان ہے جو کبھی کسی شاخ کو ناموزوں طریقے سے بڑھنے نہیں
دیتی۔ اسی نے شاعر کو تلمیذِ الرحمن کا خطاب دلوا یا اور اب وہ اسی
نام سے ہر جگہ پکارا جاتا ہے۔

قوتِ تخیلہ جس وقت خیالات کو الفاظ کا لباس نہا کر استعاروں
اور تشبیہوں کے زیور سے آراستہ کر کے ہنرمیں سخن پیش کرتی ہے تو

تو اہل بصیرت کو عجیب لطف آتا ہے۔ اس پر عبارت موزوں ہو، گو پا جو قدم بڑھتا
 ہے باقاعدہ اونچا ہوا۔ اس کا لطف سبب بالا ہے۔ اور محاورے کی سفالی زبان کی چٹنی کیسی
 نمکینی پیدا کر دیتی ہے کہ زبان اس کے کو بیان نہیں کر سکتی ہے۔ مصور اس قوت تخیل کے عمل کو
 کو ایک تختہ کا غر و کھلاتا ہے۔ اور سنائش اسی کے بتائے ہوئے پر اپنی چھینی چلاتا ہے مگر شاعر
 باتوں ہی باتوں میں مرقع سامنے لا کر دیتا ہے کہ آنکھیں کچھ نہیں دھتیں مگر دل میں اس کی
 عکس نمودار ہو جاتا ہے دیکھو ۵

آئے ہیں تیر منہ کو بنائے خفا سے آج + شاید بگڑ گئی ہر کچھ اُس ہیوفا سے آج
 شاعری خیالات کی غوبی اور نظم اُسے خوش سلوبی کے ساتھ الفاظ میں لانا ہے۔ زبان مانی
 سے مراد اس اظہار میں مدد دینا ہے اور استعارہ کو یا اشاروں ہی میں اصل مدعا کو ادا کرنا ہے۔
 کیونکہ حقیقت جو لطف کنایوں میں باقی کرنے میں آتا ہے وہ کہنے میں نہیں رہتا
 میں کسی بات کو حد سے بڑھا دیتے ہیں پھر بھی اپنے موقع پر وہ ایک مزے کی چیز ہے۔

شاعر کو قوت تخیل کی ضرورت اس لیے ہے کہ یہی شاعری کا مخرج ہے۔ مثلاً
 موزوں یعنی نظم اس لیے رکھتے ہیں کہ وہی اس کا معیار ہے۔ ورنہ جسے
 شاعری کہتے ہیں وہ اس پابندی سے آزاد ہے۔ زبان دانی کی ضرورت یوں کہ
 پڑتی ہے کہ ہر چیز کی تصویر لفظوں میں کھینچی پڑتی ہے۔ پھر الفاظ کے معنی لغت میں
 کچھ اور، مگر روزمرہ کے استعمال نے انھیں کچھ سے کچھ کر دیا ہے۔ اور اکثر موقعوں پر
 ایک لفظ سے جو کام نکلتا ہے وہ سطور میں نہیں آنے کا۔ مثلاً ۵

حضرت امینہؓ اور کبوترانِ بخیراں ✽ رہ چکے تیرے بہت دن ہم بلیسی میہاں
(حالی)
صرف ایک لفظ بلیسی نے پورا مطلب کس خوبی سے افکار دیا ہے۔

تشبیہ اور استعارے سے کسی چیز کی ٹھیک ٹھیک تصویر کھینچنے میں زیادہ مدد ملتی
ہی اور دوسروں کے دلنشین کرنے میں اور بھی زیادہ۔ ان دونوں کی لفظی ترکیب کا فرق صاف ہے
اور معنوں و وزن یکساں ہیں مگر لطف میں زمین و آسمان کا فرق ہے دیکھو کہاں ابرو،
تیغ ابرو، اگر اسے یوں کہو کہاں کی سی بھنویں اور تلوار کی سی بھنویں، تو بات
وہی مگر مزہ نہیں۔ اور اگر یوں کہئے کہ تلوار کی طرح کھینچی ہوئی اور کہاں کی طرح
چڑھی ہوئی، تو اور ہی لطف آ جاتا ہے مگر بات بڑھ گئی۔ پھر بھی کبھی
کبھی سیدھی سادھی بات میں وہ لطف آتا ہے جس پر لاکھوں ناپٹیں
قربان۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہر بات کا ایک موقع ہے اور یہ بتانے
سے نہیں معلوم ہو سکتا بلکہ شاعر خود تلاش کر لیتا ہے اور اُس کی
بتانے والی قوت متخیلہ ہے۔

شاعر جب اپنے خیالات کی روشن دنیا میں سیر کو مکھتا ہے تو
اُسے وہ نظارے جو عام نگاہوں سے پوشیدہ ہیں دکھائی دیتے ہیں
اور وہ ان پر سے حجاب دور کر کے اسے منظر عام بنا دیتا ہے وہ بے زبانوں
کی زبان سے باتیں سنتا ہے اور دوسروں کو اس طرح سے ادھر مخاطب
کر دیتا ہے کہ سب وہی ترانہ سننے لگتے ہیں۔ خوب غور کرو ۵

ہر گیا ہے کہ از زمیں روید ✽ وحدہ لا شریک لہ گوید
 جب شاعری کے اسٹیج پر ایک کرتا ہے تو ہر لحظہ نیا بھیس لپٹا
 ہے۔ کبھی ایک حُسن پرست عاشق کی صورت معشوق کی زلف دراز
 کے خیال میں غلطاں و پچاں رہتا ہے اور نرگسی آنکھیں کی یاد میں
 حیران و سرگردان۔ کبھی دنیا سے برداشتہ خاطر ہو کر معشوق حقیقی کے
 دھیان میں محو ہو جاتا ہے۔ ہر شے میں اُسی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ درختوں
 کے پتوں پر خدا کی معرفت لکھی ہوئی نظر آتی ہے۔ اور جو آواز کان میں
 آتی ہے وہ حمدِ خدا کا براہِ نام معلوم ہوتا ہے۔ شجاعت کا جوش اٹھا تو ایک
 نہیں ہزاروں ایسے جنگو میدان میں لا کر کھڑے کر دیے جن کے آگے
 رستم ایک بچہ معلوم ہوتا ہے اور زال کی حقیقت ایک بڑھیا سے زیادہ نہیں
 نظر آتی۔ لغزوں کی صداؤں سے گنبدِ گردوں گونج اٹھا اور تحت الثریٰ
 میں گا وزمین تھرا گئی۔ یکا یک بزم کا خیال آیا تو آسمان نیلگوں شامیانہ
 بنکر سایہ افکن ہو گیا۔ اور ستارے شمعیں بن گئیں جو اپنی اپنی جگہ پر روشن
 ہیں۔ زہرہ و مشتری کی گردشیں رقص کا لطف دیتی ہیں۔ ماہتاب
 جامِ شراب بھر بھر کر پیش کرتا ہے اور آفتاب کو صبحی کا انتظام سپرد ہے۔ ایک
 مدت تک مجنون بنا، بچہ کے ریگستان میں خاک چھانتا پھرا۔ پھر فرما دیکارۃ
 بھرا اور سر پھوڑ کر جان دی مگر مرنے پر بھی یادِ محبوب دل سے نہ گئی۔ اور

اور اس کشتہ ناز کو اب بھی حسرت وصل باقی ہے ۵
ہم غریبوں کا اندھیرے میں نکل جائیگا کام + آئیں تو وہ شمع تربت کے بجھانے کے لیے
کبھی مستی کے عالم میں باغ کی طرف جانا ہو گیا تو گلوں نے قہقہہ لگا جام شراب
بھر کر نذر کیا۔ غنچے سر بہرہ لیلیں سامنے لائے۔ سبزوں میں سبزہ مینا کی
جھلک نظر آئی اور بلبلوں نے خیر مقدم میں زمرہ سرائی کی۔ اس کے
علاوہ پھولوں کا کھلنا گویا ان کا منشا ہے اور کلیاں پھولی نہیں سماتیں۔
ہر چند ہنسی کو ضبط کیا مگر مسکراہٹ لبوں پر آ ہی گئی۔ شبنم کو یہ ادا بہت
بھائی اور خوشی میں اس پر سے موتی لٹائے۔ ماہتاب نے چاندنی
کا فرش بچھا دیا تاکہ صبا جو اس جلسے کی منتظم ہے اس پر سے ہو کر گزرے
تو اس کا پاؤں نہ میلایا۔ مگر وہ خود خوشی میں کب زمین پر پاؤں رکھتی ہے
اسی عالم محویت میں طبیعت نے پلٹا کھایا۔ دل میں حسرت ویاس کا
اس درجہ ہجوم ہوا کہ خوشی کو رہنے کی جگہ نہ ملی۔ وہ عیش و عشرت کا سماں ماتم غا
کا نظارہ ہو گیا۔ بلبلی کی صفت نالایاں ہی۔ اور شبنم الگ پتوں میں منہ دھاکر
رو رہی ہے۔ درخت اپنا سر دھن رہے ہیں۔ پھول ہمہ تن گوش ہوش بنے
بے شبانی عالم کا ذکر سن رہے ہیں اور ۵

کلیاں من میں سوخت ہیں جب پھول کوئی کلمات ہیں
جو دن و کویت گیو ہے وادن ہم کو آوت ہیں

سبزہ سبزہ بیگانہ ہو۔ زنگس عالم فانی کی زیرنگیاں دیکھ کر حیرت میں ہو۔
 سوسن زباں درازیاں بھولی ہے۔ اور سنبل نے اس غم میں زلفیں پریشان کر لی
 ہیں۔ سرو کو سکتے کا عالم ہے۔ اور تمام اشجار کھٹ افسوس مل رہے ہیں۔ بے اختیار
 ہو کر دل بول اٹھتا ہے

یاں بلبل اور گل پہ تو عورت آنکھ کھول ۞ گلگشتِ سمری نہیں اس گلستان کا
 گل یادگار چہرہ خوباں ہے بے خبر ۞ مرغ چمنشاں ہو کسی خوش زبان کا
 الغرض ہمارا شاعر ہر گھڑی ایک نیا رنگ دکھاتا ہو اور ہر رنگ کو
 نئے طرز سے جلوہ دیتا ہو۔ دم میں کچھ، دم میں کچھ، مشرق کی سیر کی، مغرب کی
 خاک چھانی، ابھی جنوب میں تھا۔ ابھی شمال میں نظر آیا۔ خیال کے پر کھول کر
 اڑا اور اوجِ سخن سے تارے توڑ لایا۔ پھر پستی کی طرف جھکا تو تختِ انزل سے
 سوئی نکال لایا۔ کوہِ قاف میں پریوں کا تماشا دیکھا اور پہاڑوں کے دامن سے
 لنگر پتھر چن کر ایک نظر میں ہیرے سے بھی زیادہ چمکایا۔ پھر ہیرے کو
 اٹھایا اور دم میں پتھر سے بھی زیادہ بے حقیقت کر دکھایا۔ باز اس سخن کو طبعِ طرح
 کے مضامین سے سجایا کہ خریدارانِ لطف سخن ٹوٹے پڑتے ہیں۔ کوتاہ میں آنکھیں
 ہمیشہ عیوب کی تلاش میں رہتی ہیں۔ پھر بھی حقدار کا حق کہیں نہیں گیا ہے۔
 چاہے حسدِ داد نہ دے مگر انصاف کا پنجہ اس کی گردن پر مضبوط پڑتا ہو۔ اور عدل
 حکمی کی سزا دیتا ہے۔ طبعِ سلیم کا یہ مقصد ہے کہ ہر بات کے دونوں پہلوؤں پر

نظر ڈالے نہ کہ آنکھوں پر تعصب کی پٹی باندھ کر عیوب کو ڈھونڈھے یا طفرہ کی
 کی عینک لگا کر غور سے خوبی کو زیادہ دیکھے۔ مگر نیک نیتی کی نکتہ چینی بجائے
 ملامت کے شفقانہ اصلاح ہوتی ہے۔ اور اس کی تحسین دل کو بڑھانے والی۔
 شاعری کے متعلق خود شاعر کہتا ہے ۵

بہ موزونی ز دل آہے بر آرم * کلم کوہے وزاں کاہے بر آرم
 یہاں کسی قدر تشریح کی ضرورت ہے۔ اگر کوہ کنڈن و کاہ بر آوردن
 ایک بیکاری کا شغل ہے مگر یہ گھاس کیمیا کی بوٹی ہے جو مس خام کو کنڈن
 بناتی ہے۔

اللہ اللہ! جن لوگوں نے محض اس توقع پر کہ لوگ ان کے کلام سے
 اپنا دل بہلا کر خوش ہونگے اور داد دیں گے، اپنی تمام عمر اس فن کے ترقی دینے
 میں صرف کر دی۔ ان کی اس کوشش کو رایگاں تصور کر کے ان کی
 قدر نہ کرنا صریحاً انصاف کی آنکھ میں خاک ڈالنا ہے۔



لطفِ حصار

غالب

قطعہ

اے تازہ واردان بساطِ ہوائے دل
 ز نہار اگر تھیں ہوسِ نائے وِ لُوشِ ہر
 دیکھو مجھے جو دیدہِ عبرتِ نگاہ ہو
 میری سُنو۔ جو گوشِ نصیحتِ نبوشِ ہر
 ساتی بجلوہ - دشمنِ ایمان و آگاہی
 مطرب بہ نعمۂ رہزنِ تمکین و ہوشِ ہر
 یاشب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
 دامانِ باغبان و کفِ گلِ فروشِ ہر
 لطفِ خرامِ ساتی و ذوقِ صدائے چنگ
 پہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوشِ ہر

یا صبح دم جو دیکھے آکر تو بزم میں
 لئے وہ سرور و شور۔ نہ جوش و خروش ہر
 داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
 اک شمعِ رہگئی ہے سو وہ بھی خاموش ہر
 آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں
 غالب صریحاً خامہ۔ نوائے سرور و ش



اقبال

ایک پرندے کی فریاد

وہ جھاڑیاں چمن کی وہ میرا آشیانہ
 وہ باغ کی بہاریں وہ سب کال کے گانا
 ٹھنڈی ہوا کے پیچھے وہ تالیاں بجانا
 اپنی خوشی سے جانا۔ اپنی خوشی سے آنا
 شبنم کا صبح اگر پھولوں کا منہ دھلانا
 آباد جس کے دم سے تھا میرا آشیانہ

آتا ہر یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ
 وہ ساتھ سب کے اڑنا وہ سیرِ آسماں کی
 پتوں کا ٹہنیں پر وہ جھومنا خوشی سے
 آزادیاں کہاں اب اپنے گھونسلے کی
 لگتی ہر چوٹ دل پہ آتا ہر یادِ جنم
 وہ پیاری پیاری صورت وہ کا منی سی پور

تقدیر میں لکھا تھا پنجرے کا آب و دانہ	تڑپا رہی ہی مجھ کو رہ کے یاد اُسکی
اس قید کا الٹی دکھڑا کسے سناؤں	ڈہری ہیں فغس میں میں غم سے مر نہ جاؤں
ساتھی تو میں وطن میں میں قید میں ہوں میں اس اندھیرے گھر میں تمّت کو رو رہا ہوں میں دل حلا اکیلا دکھ میں کرا ہوتا ہوں	کیا بے نصیب ہے میں گھر کو ترس رہا ہوں آئی بہار کلیاں چھوٹوں کی نہیں ہی ہیں باغوں میں بسنے والے خوشیاں منا رہے ہیں
آئی نہیں صدائیں انکی مرے فغس میں	ہوتی مری رہائی۔ امی کاش میرے بس میں
ٹھنی پہ گل کی بیچوں نادہ ہو کے گاؤں اُس اُجڑے گھوٹلے کو پھر چاکے ہیں سبائوں ساتھی جو ہیں بچے ان سے ملوں ملاؤں	ارمان ہی یہی میں اُڑ کر چمن کو جاؤں بیری کی شاخ پر ہو دیسا ہی پھر بسیرا چُگتا پھروں چمن میں دل نے ذرا ذرا سے
پھر دل بھریں ہمارے پھر سیر ہو وطن کی	اُڑتے پھر میں خوشی سے کھائیں ہو اچمن کی
دل غم کو کھار رہا ہی غم دل کو کھا رہا ہی دکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہی اس کو بھلا پنجر کیا یہ قید کیا بلا ہے	جب چمن چھٹا ہی یہ حال ہو گیا ہے گانا سے بھکر خوش ہون سننے والے آزاد جس نے رکھ دین اپنے ہوں گذارے
آزاد مجھ کو کرے اومید کرنے والے	

میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دے

ناظر

جوگی

کل صبح کے مطلعِ تاباں سے جب عالم بقیعہ نور ہوا
 سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا
 مستانہ ہوا اے گلشن تھی جا نانا ادا اے گلبن تھی
 ہر وادی وادی ایمن تھی ہر کوہ پہ جلوہ طور ہوا
 جب بادِ صبا مضراب بنی ہر شاخِ نالِ رباب بنی
 شمشاد و چنار ستار بنے ہر سرو و سمن طنبور ہوا
 سب طائرِ ملکہ گانے لگے عرفاں کی تائیں اڑانے لگے
 اشجار بھی وجد میں آنے لگے دلکش وہ سماعِ طنبور ہوا
 سبزے نے بساطِ بھجائی تھی اور بزمِ سرور سجائی تھی
 بن میں گلشن میں آنگن میں فرشِ سخاوت و سمور ہوا
 تھا دلکش منظر و شست و جہل اور چالِ صبا کی مستانہ
 اس حال میں ایک پہاڑی پر جا نکلا ناظر دیوانہ



چیلوں نے جھنڈے گاڑے تھے پربت پہ چھاؤنی چھائی تھی
 تھے خیمے ڈیرے بادل کے کمرے نے فناات لگائی تھی
 یہاں ف کے تودے گلتے تھے چاندی کے فوارے چلتے تھے
 چشمے سیلاب اُگلتے تھے نالوں نے دھوم مچائی تھی
 یہاں قلہ کوہ پہ رہتا تھا اک مست قلندر بیراگی
 تھی رکھ جٹوں میں جوگی کے اور انگ بھبوت رائی تھی
 تھا رکھ کا جوگی کا بستر اور رکھ کا پیرا ہن تن پر
 تھی ایک لنگوٹی زیب کمر جو گھٹنوں تک لٹکائی تھی
 سب خلق خدا سے بیگانہ وہ مست قلندر دیوانہ
 بیٹھا تھا جوگی ستانہ آنکھوں میں مستی چھائی تھی
 جوگی سے آنکھیں چار ہوئیں اور جھاک کر میں نے سلام کیا
 تب آنکھ اٹھا کر ناظر سے یوں بن باسی نے کلام کیا



کیوں بابا ناعق جوگی کو تم کس لیے آکے ستاتے ہو
 میں پنکھ کپھیر بن باسی تم جال میں آن پھنساتے ہو
 کوئی جھگڑا دل چپائی کا کوئی دعوے گھوڑے کا تھی

کوئی شکوہ سُن گئی ساکھی کا تم ہکوسنا نے آتے ہو
 ہم حرص ہو کو چھوڑ چکے اس نگر میں سے مُنہ موڑ چکے
 ہم جو زنجیریں توڑ چکے تم لا کے وہی پہناتے ہو
 تم پوجا کرتے ہو دھن کی ہم سیوا کرتے ہیں ساجن کی
 ہم جوت جگاتے ہیں من کی تم اس کو آکے بُجھاتے ہو
 سنسار سے یہاں کُھ پھیرا ہے من میں ساجن کا ڈیرا ہے
 یہاں آنکھ لڑائی پتیم سے تم کس سے آنکھ ملاتے ہو
 اُس مست قلندر جو گئی نے جب ناظر پر یہ عتاب کیا
 کچھ دیر تو ہم خاموش رہے پھر جو گئی سے یہ خطاب کیا



ہیں ہم پر دیسی سیلانی مت ناحت طیش میں آجو گئی
 ہم آئے تھے ترے دشن کو چتون پر میل نہ لا جو گئی
 آبادی سے مُنہ پھیرا کیوں پریت میں کیا ہے ڈیرا کیوں
 ہر محفل میں ہر منزل میں ہر دل میں ہے نور خدا جو گئی
 کیا مسجد میں کیا مندر میں سب جلوہ ہے وجہ السدا
 پریت میں نگر میں ساگر میں ہر اُترا ہے ہر جا جو گئی
 جی شہر میں خوب بہلتا ہے والِ حسنِ عشق چمکتا ہے

واں پریم کا ساغر چلتا ہی چل دل کی پیاس بھجا جوگی
 واں دل کا غنچہ کھلتا ہی ہر رنگ میں موہن ملتا ہے
 چل شہر میں سنگھ بجا جوگی بازار میں دھونی رما جوگی



ان چکینی چڑی باتوں سے مت جوگی کو پھسلا با با
 جو آگ بھجائی جتنوں سے پھڑپھڑ نہ تیل گرا با با
 ہر شہروں میں غل شور بہت اور حرص و ہوا کا زور بہت
 بستے ہیں نگر میں چور بہت سادھو کی ہی بن میں جا با با
 ہر شہروں میں شورش نفسانی جنگل میں ہی جلوہ روحانی
 ہر نگر میں ڈگری کثرت کی بن وحدت کا دریا با با
 ہم جنگل کے پھل کھاتے ہیں چشموں سے پیاس بھجاتے ہیں
 راجہ کے نہ دوارے جاتے ہیں پر جا کی نہیں پروا با با
 سر پر آکاس کا منڈل ہی دھرتی پہ سہانی مغل ہے
 دن کو سورج کی محفل ہے شب کو تاروں کی سبھا با با
 جب جھوم کے یاں گھن آتے ہیں مستی کا رنگ جاتے ہیں
 چشمے طہنور بجاتے ہیں گاتی ہے ملا رہا با با
 یاں پنچھی ملکہ گاتے ہیں یتیم کے سندیس سناتے ہیں

یار و پانوپ دکھاتے ہیں پھل پھول اور برگ گیا بابا
 ہر پیٹ کا ہر دم دھیان تھیں اور یاد نہیں بھگوان تھیں
 سب چھرا بیٹ مکان تھیں دیتے ہیں سکھی سے چھڑا بابا
 تن من کو دھن میں لگاتے ہو ہیتم کو دل سے بھلاتے ہو
 مانی میں لعل گنواتے ہو تم بندہ حرص و ہوا بابا
 دھن دولت آئی جانی ہی یہ دنیا رام کسان ہے
 یہ عالم عالم فانی ہے بانی ہے ذات خدا بابا

غزلیات انشا

کمر باندھے ہوئے چلنے کو ہم سب یار بیٹھے ہیں
 بہت آگے گئے بانی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
 نہ چھیرے نکلت باؤ بہاری راہ لگ اپنی
 بجھے اٹھیلیاں سو جھی ہیں۔ ہم بزار بیٹھے ہیں

بسانِ نقشِ پائے رہرواں کوئے تنہا میں
 نہیں اُٹھنے کی طاقت کیا کریں ناچار بیٹھے ہیں
 یہ اپنی چال ہو افتادگی سے اب کہ پروں تک
 نظر آیا جہاں پر سایہ دیوار بیٹھے ہیں
 کہاں صبر و تحمل آہ ننگ و نام کیا شہ ہے
 میاں روپیٹ کر ان سب کو ہم اکبار بیٹھے ہیں
 بھلا گردشِ فلک کی چین دیتی ہے کسے افشا
 غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دوچار بیٹھے ہیں

غالب

لازم تھا کہ دیکھو مراستہ کوئی دن اور
 تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور
 مٹ جائیگا سر۔ گر ترا پتھر نہ گھسے گا
 ہوں در پہ ترے ناسیہ فرسا کوئی دن اور
 آے ہوکل۔ اور آج ہی کہتے ہو کہ ”جاؤں“
 باناکہ ہمیشہ نہیں۔ اچھا۔ کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو ”قیامت کو ملیں گے“
 کیا خوب! قیامت کا ہر گویا کوئی دن اور
 ہاں اے فلکِ پیر۔ جواں تھا ابھی عارف
 کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور
 تم ماہِ شبِ چار و ہم تھے مرے گھر کے
 پھر کیوں نہ رہا۔ گھر کا وہ نقشہ کوئی دن اور
 ناداں ہو۔ جو کہتے ہو۔ کہ۔ کیوں جیتے ہیں غالب
 قسمت میں ہر مرنے کی تمنا کوئی دن اور

ایضاً

سب کہاں۔ کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
 خاک میں کیا صورتیں ہونگی جو پنہاں ہو گئیں
 یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزمِ آراپاں
 لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں
 تھیں بناتِ النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
 شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں
 قید میں یعقوب نے لی گو۔ نہ یوسف کی خبر

لیکن آنکھیں روزِ دیوارِ زنداں ہو گئیں
 جوے خوں-آنکھوں سے بنے دو-کہ ہر شامِ فراق
 میں یہ سمجھوں گا کہ تمہیں دو فروزاں ہو گئیں
 وہ گاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
 جو مری کوتاہی قسمت سے مڑگاں ہو گئیں
 بسکہ روکامیں نے اور سینہ میں بھریں پی بہ پی
 میری آپس بجیہ چاکِ گریباں ہو گئیں
 رنج سے خوگر ہوا انسان-تو مٹ جاتا ہر رنج
 مشکلیں مجھ پر ہیں اتنی کہ آساں ہو گئیں
 یوں ہی گردِ روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
 دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

ایضاً

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
 ہم سخن کوئی نہ ہو-اور ہنرِ باں کوئی نہ ہو
 بے در و دیوار سا اک گھر بنا یا چاہیے

کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
 پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہوتا ردار
 اور اگر مر جائیے تو نو حہ خواں کوئی نہ ہو

ایضاً

میرے دکھ کی دوا کرے کوئی دل میں ایسے کے جا کرے کوئی ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی وہ کہیں اور بنا کرے کوئی کچھ نہ سمجھ خدا کرے کوئی نہ کہو۔ گر بُرا کرے کوئی بخش دو۔ گر خطا کرے کوئی کس کی حاجت روا کرے کوئی اب کسے رہنا کرے کوئی	ابن مرتضیٰ ہو کرے کوئی چال۔ جیسے کڑی کمان کا تیر شرع و آئین پر مدار سہی بات پر دواں زبان کھتی ہو بکے ہونچوں میں کیا کیا کچھ نہ سنو۔ گر بُرا کرے کوئی روک لو۔ گر غلط چلے کوئی کون ہو۔ جو نہیں ہو حاجتمند کیا کیا خضر نے سکندر سے
--	--

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
 کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

ایضاً

کوئی امید بر نہیں آتی موت کا ایک دن معین ہر آگے آتی تھی حال دل پہنسی جانتا ہوں ثوابِ عت وز ہر ہر کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہو کیوں خچوں؟ کہ یاد کرتے ہیں دلِ غم دل گر نظر نہیں آتا ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی مرتے ہیں آرزو میں نے کی	کوئی صورت نظر نہیں آتی نیند کیوں رات بھر نہیں آتی اب کسی بات پر نہیں آتی پر طبیعت ادھر نہیں آتی ورنہ کیا بات کر نہیں آتی میری آواز گر نہیں آتی بوجھی اے چارہ گر نہیں آتی کچھ ہماری خبر نہیں آتی موت آتی ہی پر نہیں آتی
--	--

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شہرِ مہتمم کو مگر نہیں آتی

ایضاً

رات دن گردش میں ہیں سات آسمان

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبراؤں کیا
 موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
 آستانِ یار سے اٹھ جاؤں کیا
 عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ
 مر گئے پردے دیکھے، دکھلاؤں کیا
 پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
 کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلاؤں کیا

سہرا

خوش ہوا ہے بخت کہ ہی آج ترے سر سہرا
 باندھ شہزادے جواں بخت کے سر پر سہرا
 کیا ہی اس چاند سے کھڑے پہ بھلا لگتا ہے
 ہی ترے حسنِ دل افروز کا زیور سہرا
 سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرفِ کلاہ
 جھکو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا نمبر سہرا
 ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی

ورنہ کیوں لائے پیشی میں لگا کر سہرا

سات دریا کے فراہم کیے ہوں گے موتی

تب بنا ہو گا اس انداز کا گز بھر سہرا

سُخ پہ دوٹھا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا

ہر رگ ابر گہ بار سہرا سہرا

یہ بھی اک بے ادبی ہے کہ قبا سے بڑھ جائے

رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز

چاہیے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا

جبکہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے

گوند سے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا

سرخ روشن کی دمک گوہر غلطاں کی چمک

کیوں نہ دکھلاے فروغِ مہ و آفتاب سہرا

تارِ ریشم کا نہیں ہے یہ رگِ ابرو بہار

لائے گا تاب گراںباری گوہر سہرا

ہم سخنِ فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں

دیکھیں اس سہرے کدے کوئی بہتر سہرا

	ذوق	
	سہرا	

اے جواں بخت مبارک تجھے سر پر سہرا
 آج ہی مین و سعادت کا ترے سر سہرا
 آج وہ دن ہے کہ لاسے دُرا بخم سے فلک
 کشتی زر میں مہ نو کی لگا کر سہرا
 تابشِ حسن سے مانند شعاعِ خورشید
 سرخ پہ نور پہ ہے تیرے منور سہرا
 وہ کہے صلّ علیہ یہ کہے سبحان اللہ
 دیکھے ٹکڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا
 تابنی اور بنے میں رہے اخلاص بہم
 گوند جیسے سورہ اخلاص کو پڑھ کر سہرا
 دھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی
 گامیں مرغانِ نوا سنج نہ کیوں کر سہرا
 روئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار

تار بارش سے بنا ایک سراسر سہرا
 ایک کو ایک پہ تزیں ہے دم آرایش
 سر پہ دستار ہی دستار کے اوپر سہرا
 اک گہر بھی نہیں صد کان گہر میں چھوڑا
 تیرا بنوایا ہے لے لے کے جو گوہر سہرا
 پھرتی خوشبو سے ہوا ترانی ہوئی باد بہار
 اللہ اللہ رے پھولوں کا معطر سہرا
 سر پہ طرہ ہے مزین تو گلے میں بدھی
 کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو منہ پر سہرا
 رونمائی میں تجھے دے مہ و خورشید فلک
 کھول دے منہ کو جو تو منہ سے اٹھا کر سہرا
 کثرت تارِ نظر سے ہے تماشا یوں کے
 دمِ نظارہ ترے روئے نکو پر سہرا
 دُرِ خوش آبِ مضامین سے بنا کر لایا
 واسطے تیرے تراذوقِ ثنا گر سہرا
 جس کو دعوئے ہی سخن کا یہ سنادے اُس کو
 دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخن ور سہرا

غزل

کسی بیکس کو اسے پیدا کر مارا تو کیا مارا
 جو آپ ہی مر رہا ہو اُس کو گر مارا تو کیا مارا
 بڑے موزی کو مارا نفس اتارہ کو گر مارا
 نہنگ و اژدہا کوشیر ز مارا تو کیا مارا
 نہ مارا آپ کو جو خاک ہو اکسیر بجاتا
 اگر پارے کو اسے اکسیر گر مارا تو کیا مارا
 گپا شیطاں مارا ایک سجدہ کے نہ کرنے میں
 اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا
 دل بدخواہ میں تھا مارنا یا چشم بد میں میں
 فلک پر ذوق تیرا آہ گر مارا تو کیا مارا

ایضاً

(مرزا غالب)

آخراں درد کی دوا کیا ہے
 یا الہی یہ ماجہ کیا ہے

دلِ ناداں بچھے ہوا کیا ہے
 ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار

کاش پوچھو کہ تر کیا ہے پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے جو نہیں جانتے وفا کیا ہے اور درویش کی صدا کیا ہے میں نہیں جانتا دعا کیا ہے	میں بھی سنہ میں زبان کھتا ہوں جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود سنہ و گل کہاں سے آئے ہیں ہم کو ان سے وفا کی ہو امید ہاں بھلا کر۔ ترا بھلا ہوگا جان تم پر نثار کرتا ہوں
--	--

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

انیس

گنہ کا بوجھ جو گردن پہ ہم اٹھا کے چلے
خدا کے آگے خجالت سے سر جھکا کے چلے
کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی
چلے جو راہ تو چوٹی کو ہم بچا کے چلے
مقام یوں ہو اس کا رگاہ دنیا میں
کن جیسے دن کو مسافر سرا میں آ کے چلے

طلب سے عار ہے اللہ کے فقیروں کو
 کبھی جو ہو گیا پھیرا صد اسنا کے چلے
 آئیس دم کا بھروسہ نہیں ٹھہ جاؤ
 چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے



مدارج دوستی

(از خان بہادر سید علی محمد شاد)

دوستی بھی عجب اک نعمت ربانی ہے ہیں جہاں تہا صفتیں سب میں لاثانی ہر
 کامل انسان ہو اس کو کا جو ربانی ہے یہی پائندہ ہر اور کل جہاں فانی ہر
 پست تر نعمت افلاک ہو اس کے آگے یہ وہ دولت ہو کہ سب خاک ہو اس کے آگے
 دوست وہ ہر نہ کبھی دوست جو منہ مٹوے سختیوں میں نہ کسی دوست کو دم بھر چھوڑے
 دوست کے ساتھ اگر شہرہ الفت جوڑے زندگی بھر نہ کبھی بھول کے اس کو توڑے
 رنج پہنچے بھی تو اقدام شکایت نہ کرے
 لغزشیں دوست ہو جائیں تو نفرت نہ کرے

اس طرح دوست ہو دوست کو الفت جانی جیسے مل جاتا ہے ہر رنگ میں جا کر پانی
آدمی ہی وہی اس صنف کا جو ہو بانی صفت بھی ہی بشر میں صفت و جدانی

دوستی طبع میں ہو مہر و ولاصلت میں

غیر اپنے ہوں وہ انداز رہے غفلت میں

ہر قدم دوست کا ہر دو کو واجب ہر خیال رہے یہ دھن کہ کسی دوست کو پہنچے نہ ملال

میل دیکھے جو ذرا کر لے صفائی فی الحال دل ہو آئینہ صفائی کہیں ٹپ جائے نہ بال

دست رس دل پہ ہو جتنا اُسے جلنے ہی نہ دے

بات کروہ کوئی نہیچ میں آئے ہی نہ دے

دستی چیز ہو کیا لذت نفسانی ہے جسم سے گم تعلق ہو تو جسمانی ہے

روح پر محض اثر ہو تو وہ روحانی ہے ہو جو نہر سے تعلق تو وہ ایمانی ہے

سب کے اسباب جدا گانہ ہیں سامان جدا

طرز و انداز جدا مات جدا شان جدا

دنیا کے تعلق اور حضرت آدم و حوا مکالمہ

میں تصور میں اپنے جان نکلا
ساتھ بیٹھے تھے آدم و حوا

واہی قدس کی طرف اک دن
کرسی نور پر بصد شوکت

بھولی بھولی یلج و شکلیں
 اس بڑھاپے پر رخ کا وہ عالم
 ایڑیوں تک وہ بسے بسے بال
 میں نے جاتے ہی جھک کے کی تسلیم
 میں نے کی عرض واہ دادا جان
 خوش کسے کہتے ہیں کہاں کی خوشی
 ایک دل اور خیال بے گنتی
 اونٹ کی کوئی کل نہیں سیدھی
 کہیں روٹی کی فکر میں سرگرم
 نہ ہوں بچے اگر تو اس گنہگار
 نا تو اس سپہ کوئی تو روگی ہے
 ساتھ والوں میں سب کی دجوتی
 گر پڑا گھر مرست اسکی ضرور
 پھر غضب یہ کہ ہوس ٹیکس میں بیٹ
 قرض خواہوں کا ایک سمت ہجوم
 ہاتھ میں ہی معاش تھوڑی سی
 سر پہ قسطیں کا کٹری کی الگ

پیارا پیارا بھرا بھرا نقش
 دیکھیں یوسف اگر تو ہو سکتا
 قد کشیدہ درست سب اعضا
 ہنس کے فرمایا خوش رہو بابا
 یہ تو حضرت نے خوب فرمایا
 کون خوش ہے بتائیے تو ذرا
 ایک سر اور ہزار ہا سودا
 جس طرف دیکھئے اُدھر کانٹا
 کہیں کپڑوں کا دھیان جاں فرسا
 ہرے بچے تو اور بھی ایذا
 سب کی تعلیم کا الگ جھگڑا
 نفس کو بات بات کی پروا
 لایئے جس طرح بنے پسیا
 دھنیاں اور کواڑ اور کھمبا
 اُن کی وہ شدتیں پنہ بخدا
 وقت پر اس سے کچھ نہیں آتا
 چاہے پیدا ہو یا نہ پیدا

دشت سنان اور اندھیرا گھپ
 اک طرف شیر اک طرف افنی
 کوہ کی راہ بہ طرف مسدود
 اس پہ آنکھوں میں باندھ کر بیٹی
 ہائے کیوں آپ کھا گئے گیہوں
 عقل والی کہاں کی ایسی تھیں
 ان کے کہنے کو آپ مان گئے
 میری باتیں تھیں سب ٹھکانے کی
 زندگی کو کتاب تم سمجھو
 مجھ سے جتنا گلہ کیا تم نے
 جی چڑاتے نہیں ہیں طالب علم
 کہیں ڈگریڈ تم نہ ہو جاؤ
 پاس کر لو کئی کلاسوں کو
 پاس کر کے جو یاں سے نکلو گے
 پھر یہ کھیتی بتاؤ کب ہوتی
 آؤ جھک جاؤ پیار تو کروں

کوئی رہبر نہ روشنی عرصا
 اک طرف کوہ اک طرف دیا
 شور طوفاں سے منقلب دیا
 ہم کو حکم سفر تنہا
 اس میں کینٹ کیا دھرا تھا مزا
 یہی حضرت ہماری ماں حوا
 کاش کچھ سوچ بھی لیا ہوتا
 ہنس کے بولے کہ صبر کر بیٹا
 تم ہو طالب تو مدرسہ دنیا
 یہ سن بھولنے کی سب ہی مزا
 پہنچے مکتب میں گر کوئی ایذا
 گر یہی ہمتوں کا ہے نقشا
 ہوں اگر سختیاں تو کیا پروا
 سارے دکھ درد پھر تو خود ہیں ہوا
 میں ہی گیہوں اگر نہ کھا جاتا
 پھر نہ مکتب کا کچھو شکوا

باخود ہو سمجھ کے بات کرو

بند رکھو زبان کو بابا

پٹنہ کے اگلے شرفا

بھڑا ہوا تھا شریفوں سے شہریوں سارا
وہ صورتیں متبرکے اُن کی شان شکوہ
وہ اُن کی وضع متیں اور لباس لانی
وہ کان دار کلاہ استہق کی فراخ
ہراک کو وضع کا پاس اپنے دوستوں کا لحاظ
کسی کو نہ کرا ذوق اور کسی کو نظم کا شوق
وہ دوستوں سے عزیزوں کی طرح مل جانا
سنو غریبوں کی حالت امیر تو ہیں یہ
نہ نکلیں گھر سے جو نکلیں تو شان نکلیں
باشیتیں وہی منہ پر نہار ہو تکلیف
لیے دیے ہوئے اور آبرو بنائے ہوئے
مہذب ایسے تھے جاہل بھی اس زمانہ کے
محاوروں میں وہ شیریںیاں کہ صل علی

کہ جیسے قطرہ باراں سے ابر دیا بار
مہذبانہ وہ باتیں وہ جاں فزا گفتار
وہ اُن کے غمِ دُست اور چچی تلی رفتار
وہ اُن کے گھٹیلے جوتے وہ پائینچے بردار
لبوں پہ خلوت کی باتیں لول میں صبر و قرار
فیض و صاحب نقواؤ کا سب و ابرار
برائیوں سے کنارہ شکایتوں سے عار
مجال کیا جو کریں اپنے حال کا اظہار
کہ اپنے ہاتھ سے جانے نہ پائے اپنا وقار
طلب کا نام نہ لائیں زبان پر زہار
کہ تانہ سمجھے کوئی اُن کو مفلس و نادار
کہ اہل علم میں کرے زمانہ اُن کو شمار
وہ جب کریں تو بہرہ ہستی کریں گفتار

نہ بات بات پتھیں نہ فقہے بے وجہ
 متین وہ لب و لہجہ وہ مختصر باتیں
 جھکائے سر کو شرافت سے راستہ چلنا
 کریم غریب کا بھی تابہ فرش استقبال
 نشست اُن کی دوز اُن کو نارہ مکیوں سے
 لحاظ بھائیوں تک میں بھی باپ بیٹوں کا
 ہر اک کو حفظ مراتب میں تکملہ حاصل
 بہادرانہ انگلیں سپاہیانہ شوق
 کوئی جگہ کوئی صحبت نہیں کہ ہوں نہ وہاں

نہ وہ کلام کہ سن کر عقیل ہوں بیزار
 فضول گو نہ غفلت سے اپنی کچھ سروکار
 ادب سے ہاتھ اٹھانا سلام کو ہر بار
 بہت لحاظ کہ آئے نہ اس کے دل پہ غبار
 معاشرت سے عیال انضباط و صبر و قرار
 یہ کیا مجال کہ مرکز سے بڑھ کے ہو گفتار
 ہر اک سے جھک کے تعارف صغار ہوں کہ کبار
 جریب ست مبارک ہیں اور کمر میں کٹار
 مورخ و شعرا و ادیب و نشر نگار

صبر علی البلاء

محنت سرائے عشق میں ایسے دو کیا نہیں
 کہہ دو یہ قیس سے کہ شکایت رو نہیں
 ایذا نہیں کہ سر پہ ہجوم بلا نہیں
 لیلی کا فصل لائن چون و چرا نہیں
 رورو کے خوں کو موردِ خواری بنا کر گا
 کملی جگلو کے اور بھی بھاری بنا کر گا

وصف زبان

(از سرور جہان آبادی)

نیرے لظن میں ہر عجب جا افزائی شکستہ دلوں کو ہی تو موسمیائی
بھری بچھ میں ہر کیرٹ کر دلربائی تری ہر ادائیں ہر رنگیں ادائی

وہ جا دو بیاں لظن کی تو دامن ہے
کہ لٹ تیرے گیسو کی زلف سخن ہے

جواہر کی لڑیاں ہیں فقرے مسلسل کہ ہی تو فصاحت کی گردن کی ہیکل
ستم! تیری شوقی غضب! تیری چل بل مگر ہر کسی بت کے پاؤں کی چھاگل

تکلم کے گھنگر و بجاتی ہے چھم چھم
کہ تو ناطقہ کو چلاتی ہے چھم چھم

پیہا کبھی بن کے تو بولتی ہے کبھی بن کے طوطی شکر گھولتی ہے
ہر اک راز مر بستہ کو کھولتی ہے کہ کانٹے میں پھولوں کو تو تولتی ہے

سخن سنج ہی تیری میزان دانش

ترا لظن ہے جو ہر کان دانش

بنایا عجب تیرا قدرت نے پیکر کلا لظن کا روغن قاز منہ پر
کیا نظم نے زیب سرا کے جھومر پنہایا تجھے نثر نے اپنا زیور

بلاغت نے ہاتھوں میں ہندی لگائی

فضاحت نے زلفِ معنہ بنائی

دہن میں جو تو بن کے تقریر آئی ترے ساتھ لفظوں کی تاثیر آئی

لیے حسن معنی کی تنویر آئی کہ تو لظن کی بن کے تصویر آئی

بجائی ہوئی ارگنِ لظن آئی

اڑائی ہوئی تو سنِ لظن آئی

وہ دلچسپ پنچر کا چھیڑا ترانہ کہ غش ہو گیا جس کو سنکر زمانہ

کیا لظن نے تیرے گیسو میں شانہ کہ حق وضع تیری عجب شاہانہ

بجھے قال نے اپنے سانچے میں ڈھالا

رنجیلی! غضب تو نے جو بن نکالا

فضاحت کے پھولوں کی اوگنے والی تکلم کے پردے میں اوڑھنے والی

کسی کی کڑی تو نہیں سننے والی کہ ہر ایک کی منہ پہ دس کہنے والی

نہیں تجھ کو صولت پناہوں کی ہیبت

کہ غالب نہیں تجھ پہ شاہوں کی ہیبت

سناں ہو کہ نیزہ - چھری ہو کہ خنجر زرہ ہو کہ بکتر ہو - یا خود و مغفر

ہوا و رنگ و دیہیم - یا تاج و افسر ہیں تیرے لیے اے زباں سب برابر

وہ آزادِ رو ہے کہ رکتی نہیں تو

وہ سر ہے - درِ شہ پہ چھکتی نہیں تو

جوشیلے جوانوں کو لڑوانے والی اکھاڑے میں شیروں سے بھڑکانے والی
سواروں کے نیزوں کو چمکانے والی شجاعی کے شعلوں کو بھڑکانے والی

جو تو بڑھ کے کرٹ کے سناٹی ہیرن میں

دلیروں کی ہمت بڑھاتی ہیرن میں

بندھاتی ہی تو رائڈیوؤں کی ہمت یتیموں سے کرتی ہے اظہارِ شفقت
مریضوں کو دیتی ہی تسکینِ صحت کہ ہر تیرے لب کی مفرحِ حلاوت

ترے ہونٹ ہیں نوشِ دارو کے سادہ

مقوی ہیں یا تمہیں سے زیادہ

کہیں شدہ ہے تو کہیں قندہ ہی تو مواعظ کہیں ہی - کہیں پندہ ہی تو
دہن میں نظر بند ہر چند ہے تو مگر وقتِ تقریب کب بند ہے تو

روانی میں ہوکیل - چلنے میں صرصر

چھلاوہ ہی شوخی میں - تیزی میں خنجر

عباں ہیں ترے نکتہ سنجوں پہ جوہر کہ ہی تو بشر کے فضایل کا زیور
ہر اقلیم میں ہے ترا سگہ زر کہ زیرِ نیگیں ہی ترے ہفت کشتور

چمک تیری ہر تاج و دہیم میں ہے

نئی شاہزادی ہر اقلیم میں ہے

جو تواسے زبان ایشیا کی پری ہے تو یورپ کی لیڈی شرارت بھری ہے
 کہیں پہلوی ہے۔ کہیں تو دری ہے سخن کے حدیقہ کی کبابِ دری ہے
 کہیں تو ہے بھاشا۔ کہیں فارسی تو کہ ہے شاعرِ لفظ کی آرسی تو
 ترانہ کہیں تو ہے مطرب کے لب پر کہیں تو ہے جاوید بیانوں کے لکھ
 کہیں بذلہ گو ہے۔ کہیں پند گستر کہیں طوطی شکرستانِ پنجر
 زمانہ ہے شیدا تر اور نیگیلی !
 ادا ہے سیلی۔ صدا ہے سُر تلی



گھوڑے کی تعریف

(ابنِ حضرت میرانیس)

آہو کی آنکھ شیر کی چپوں غیب کی چال دہ بال تھے کہ حور نے بکھرا دیے تھے بال
 گردن کے خم کو دیکھے ہو سرنگوں ہال پوچھے کوئی سیار سے شایستگی کا حال
 اڑ کر نہیں تلک کبھی گرجت م گئی
 جب بس کہا چمکتی ہوئی برقِ تھم گئی

جہارت میں شک شیر تو پیکل میں ہیں تن پونی کے وقت کباب درمی جست میں ہن
 بجلی کسی جگہ۔ تو کہیں ابر قطرہ زن بن ہن کے آنے جلانے میں طادس کا چلن

سیماب تھازیں پہ فلک پر سحاب تھا

دریا پہ موج تھا تو ہوا پر عقاب تھا

پیکاں ہیں یا کینوتیاں ہنگام دار دیگر حلقے سے یوں نکلتا ہر جیسے کماں سے تیر

روشن وہ نرم جلد وہ بارکایت بے نظیر چینی پرند جس سے مقابل نہ ہی حیر

ایسی سبک روی نہیں دیکھی شباب میں

دوڑے تو فریق آئے مغل کے خواب میں

وہ گشت اور اس کے طار سے وہ آؤ جاؤ پانی پہ گرجاب تو آب رواں میں ناؤ

گھونگھٹ میں دیکھ پائے اگر چال کا بناؤ دو لہا کے دل میں پھرنے ہے کچھ داس کی چاؤ

دعویٰ غلط خرام میں کباب درمی کا ہے

اس باد پاک کے سایہ میں جلوہ پری کا ہے

خوش و خوش خرام و خوش اندام و خوش لگام خونہ و خوش حال و دادا فہم و تیز گام

جاندار و شوخ چشم و سعید و خستہ کام گل پوش و تیز ہوش سمن گوش و لالہ نام

غازی تھا۔ سرفراز تھا۔ عالی و ماغ تھا

گویا ہوا کے دوش پہ اک زندہ باغ تھا

چالاکیاں بھی غیظ بھی غرمت بھی جنگ بھی بالادوی براق کی دلدل کا ڈھنگ بھی

بریں اسد بھی - بحر و غامیں نہنگ بھی گھڑا بھی شیر نہ بھی - ہرن بھی پلنگ بھی

ہو آگ کا مزاج تو سرعت ہوا کی ہے
اضداد اتنے جمع ہیں قدرت خدا کی ہے

کوہی ہو وہ تندر ہو کیا اسکی چال کیا طاؤس کیا ہمارے سعادت خصال کیا
کیا پیک عقل شاطر وہم و خیال کیا اس کے قدم کی گرد کو پہنچا مجال کیا

دیکھی نہیں کسی نے یہ چھل بل سسند ہیں
پارہ بھرا ہوا ہر اک جوڑ بند ہیں

شاہ دکن کی تعریف

(از فیض الملک داغ دہلوی)

شاہ عادل شاہ باذل مہربان و مہربان بہ محل ہو لطف اسکا بہ محل ہو اسکا قہر
کیا دکن کیا ہندوؤں کی ہو خلیفتہ شاہ آصف شاہ کی دو ہو ساری لہر ہو

امید

(از کلام حضرت بیان ہندوانی مرحوم)

زمانہ اگر صحن باغ ابرم ہے تو تو اسے امید اس کی ابر کرم ہے

شکوہوں میں جھپتی ہی تو مسکرا کر
 تنہا کے کھیتوں میں بلبل ہے تیری
 توہی یوں کے پودوں میں دیتی ہی پانی
 شکوہوں کے کوچوں میں تو دوڑتی ہی
 ترے سر پہ تاج شہی سج رہا ہے
 چڑھی تو مخالف پر لشکر کو لیکر
 دیا تو نے سلطان کو خلعت سُندھرا
 توہی ہی جو انوں کے گھوڑوں کی کاٹھی
 اٹھایا پانچ کو بستر سے تو نے
 جگاتی ہی چھینٹوں سے تو غافلوں کو
 رگوں میں لہریں کے تو دوڑتی ہی
 توہی ڈوبتی ناؤ کا ہے کنارہ
 سمندر میں نلین کو لیکر گئی تو

توہی کھل کھلاتی ہی پھولوں میں کہ
 تدرک میدان میں چھل بل ہی تیری
 ہر آنچ سے ہی گاشن زندگانی
 یہ تو دوڑتی ہی کہ بُودوڑتی ہے
 ترے در پہ کوس شہی بج رہا ہے
 پھری باج لیکر چلی تاج لیکر
 ہوا میں ترمی اڑ رہا ہی پھریرا
 توہی ہی ضعیفوں کے ہاتھوں کی لاٹھی
 جلایا ہی مردوں کو ٹھوکر سے تو نے
 اٹھاتی ہی شہنشاہ سے تو کاہلوں کو
 ترے ساتھ ساتھ آرزو دوڑتی ہے
 توہی دیتی ہی ڈوبتے کو سہارا
 ونگلن کو میدان لیکر چڑھی تو

کو بٹس کو تیری ہی لہر ابھی تھی
 ڈوگام کی آنکھوں میں لہر ابھی تھی



معرفت الہی

(از حضرت انیس)

آنکھیں جنھیں ٹھونڈھنتی ہیں وہ نور ہے تو
اللہ اللہ کس قدر دور ہے تو

بتی کی طرح نظر سے مستور ہے تو
نزدیک رگِ جان سے اُس پر پہنچ

قبر

سب سے پہلے کے منہ دکھایا ہی تھے
میں نے بھی تو جان وکے پایا ہے تھے

مرمر کے مسافر نے بسایا ہے تھے
کیونکہ نہ لپٹ کے تجھ سے سوؤں اگر قبر

قدرت باری تعالیٰ

ہر پھول سے صنعت صمد پیدا ہی
ہر ایک نفس سے جزو پیدا ہی

ہر برگ سے قدرت احد پیدا ہی
سینہ ہی بشر کا وہ محیطِ ذخار

سخن جان ہے

اور صاحبِ چشمِ دگوش ہو جاتا ہے
کیوں مر کے بشر خموش ہو جاتا ہے

انسان ذی عقل و ہوش ہو جاتا ہے
گر جان نہیں سخن تو تبتلائیے پھر

معرفت خدا

گلشن میں پھروں کہ سیر و ریاضیوں ہر تیری صنعت کے ہیں لاکھوں جلوے	یا معدن کوہ و دشت و دریا و بکھوں حیراں ہوں کہ دوا نکھوں سے کیا کیا دیکھوں
رحمت باری	
ماں سے بھی سوا ہر شفقت تیری جنت انعام کر کہ دوزخ میں جلا	افروں ہی پر ہے غضب سے رحمت تیری وہ رحم تیرا ہی یہ عدالت تیری
وادِ سخن	
نا فہم سے کب وادِ سخن لیتے ہیں چھپتی نہیں بوسے دستانِ گیرنگ	دشمن ہو کہ دوست سب کی سُن لیتے ہیں کانٹوں کو سٹاکے پھول چُن لیتے ہیں
موت	
اس گرم خسرویت کے کائنات کی ہے ہستی کے لیے فروغِ کائنات ہی نانا	نارِ اداں گھٹے لکڑیاب و دانے کی ہے آنا تیرا دلیل جانے کی ہے
مروتی	
رتبہ جسے دیتا ہی خدا دیتا ہے	یہ دال میں مروتی کو جا دیتا ہے

کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی	جو خوف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے
شیریں کلامی	
نہ مدح کا دعویٰ ہو نہ خود بینی ہے	باتوں میں اثرِ زباں میں نگینی ہر شیرینی میں ہر نمکِ حلاوت دیکھو ہر طرف مزا نمک میں شیرینی ہر
مشاک آست کہ خود بوید	
کس منہ سے کہو لالینِ تحسین میں	کیا لطف جو گل کہے کہ رنگیں ہوں میں کتنی ہر کہیں شککہ شیریں ہوں میں
ہر سال عمر بڑھتی نہیں بلکہ گھٹتی ہے	
دل سے طاقت بدن سے کس جاتا ہو	آتا نہیں پھر کہ جو نفس جاتا ہے جب سال گرہ ہوئی تو عقدہ یہ کھلا یاں اور گرہ سے ایک برس جاتا ہے
❖	

زمرہ قصیری

(لازمی شمس العلماء مولانا عالی)

زیبے تیا ہی اگر کیسے تھکتے سارے جہاں
موج زن ہے ایک جانب تیرے بحر بیکراں
ہر سدا چھایا ہوا جس چرخوشی کا سماں
جبکہ اس میں آگے گرتی ہیں ہزاروں دنیاں
(دست گلچین نارسا و غل دولت گل فشاں)
پھر ضرورت کیا کہ کھولیں بے سبب تیرا نشان

اے حصا عافیت امر کشور ہندوستان
اٹل فن کھینچی ہے قدرت نے تری دیوارِ کوہ
چوٹیوں پر ہے پہاڑوں کی وہ عالم برف کا
بحر میں ہوتا ہے اک شور قیامت آشکار
خوف باہر کا ہے کچھ اور نہ کچھ اندر کا فکر
تو نے قانع کر دیا ہے فتح ملک غیر سے

چل ہی ہے امن کی ہر سو ہوائے خوش گوار
(ہونہ اب کمد و خزاں سے رخنہ انداز بہار)

قوم کے ہمدرد ہوتے اس مکان کے سب کمیں
جم گیا آب ہواے دہر سے وہاں تخم کمیں
(غور سے دیکھا تو) پنہاں تھے درندہ جی وہیں
جننا دن چڑھتا گیا ہوتا گیا غلٹ گزیں
فانیوں کی طرح یہاں آکر رہے وہ لہشیں

ہند کا حق تھا کہ ہونی تہذیب کی زیں
حیف جس مٹی سے اگنا چاہیے تھا نخل ہر
سہرے تھے گل خود رو کے جس شکل میں تھے
اس قایم تھا طلوعِ صبح کے آغا ز میں
دیوتا جو آریا کے نعم میں فانی نہ تھے

۱۔ یہ شعریہ ہی طرف سے اس لیے بڑھا دیا گیا ہے تاکہ بندہ کے پورے سات شعر ہو جائیں ۱۲ عالی

ورنہ فتنہ کا قدم تہا پہاں آیا تھا کہیں	جنگِ خونریزی کے خود آکر ہوئے وہ رہنما
ایک بیک آیا خلل اس جہاں میں ہر طرف اک تزلزل پڑ گیا ہندوستان میں ہر طرف	
اس خن ابی پر بھی روکے تو نے حملے بار بار چشمہ حیاواں پہ جب کو لے گیا بختِ رسیا اور نیچر کے طلسموں میں خلل آیا نہ تھا سایہِ سہیت تھا جن پر سرسبز چھایا ہوا پر نہ ہرگز تیرے سارے مرحلے طے کر سکا (دلیپن جی) امان تھا ڈل کا دل ہی میں رہا	مرجبا اخطہ ہندوستان (صد مرجا) جانتا ہوں کہ جہاں اسکندر اعظم کا نام تھا جہاں خرافات اور ستانا بشر کا سد راہ گھرے اور تاریکیوں میں تھا اب زندگی گو ہوئی اُس کی رسانی چشمہ حیاواں تلک جی میں جی حسرت تھی وہ آخذ نہ نکلی زینہار
دقتوں نے فتح کی بے طرح گھبرایا اُسے کام ہی مشکل تھا یا مشکل نظر آیا اُسے	
جس سے ظاہر ہو کہ حالتِ ہند کی ہو آج کیا اور آزادی نے کر رکھا ہر ہر اک کو جُدا پایہِ نظم و نسق پہنچا ہے تالوقِ آسمان	راگنی اب وقت کی ہم چھپرتے ہیں بر ملا اتفاق اور دوستی نے کر دیا ہر سب کو ایک ملکتِ فوجوں سے اور قلعوں سے ہر مہمور سب
۷ یعنی سب کو اسے کی آزادی حاصل ہو۔ شخص ایک دوسرے کے اور خود گورنمنٹ کے خلاف اسے دینے کا مجاز ہے گویا آزادی کی حیثیت سے جُدا جُدا ہیں اور اتفاق کی حیثیت سے سب ایک ہیں ۱۲	

سیرہ دو تاج ہمایوں ہند کے رکھے گئے برخلاف اُس ملک کے جو ڈھاک رہا ہیروک بھڑوینک غول پھرتے پنوں میں چپڑ کے	۱ ۲	واجبی حق الغرض مدت کے بعد اُسکو ملا ہر طرف سے بن ہی بن اور قحط ہی جاندار کا ناکہ جو بلجائے وہاں آوارہ و شبت بلا
--	--------	---

کر کے چھڑیں اُس کو ایسا بیکس بے خانماں حشاک پیار رہیں فرقت میں اُسکی نوحہ خواں

بارے ایسی ہند کی حالت نہیں زار و نزار فرض کیجے کل بنی آدم کے چھ حصے اگر ہی یقین مقدار اُسکی اُس سے بھی بڑھ جائے کچھ زندگی کی ریت اب ٹھنڈی شیشے میں سوا اس قدر بندوئی روزی کا ہمیں کیوں فکر ہو کچھ نہیں تو قحط کا دورہ سلامت چاہیے	۱ ۲ ۳ ۴ ۵ ۶	ہی موافق اُس کی صحت کے عیث کا شمار ایک حصہ اُس میں اہل ہند پائیں گے قرار کیونکہ فتنہ کو نہیں ملت سے ملتا اُس میں بار پیشتر جس کے نکلنے کا بندھا رہتا تھا تار ہر خدا کے حکم پر سب کی معیشت کا مدار بڑھنے پائے گانہ آدم زاد کا حد سے شمار
--	----------------------------	--

یاور کھ لے مُنکرجن - ہی یقین اصل نجات وسوعل سے اور کھل جاتی ہی راہ مشکلات
--

۱۱۔ یہ روس کے ویران اور غیر آباد ملک کی طرف اشارہ ہے

۱۲۔ اس خیال سے مترشح ہوتا ہے کہ شاعر کے نزدیک غریب ہندوستانیوں کی جانب سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں رخصت نہیں رکھتیں۔ کاش وہ ہندوستان کی آبادی گھٹنے کے لیے یہ امید (یعنی مایوسی) آئندہ پرکھو۔

ہو زیریں ساری خدا کی برکتوں سے بہرہ ور اوچھ کر کیا پاسبیہ۔ کچھ بھی قناعت ہوا اگر یا لوی گنگا کے میداں۔ نہیں زرخیز تر طرفہ کیفیت ہے ہلوں میں دل کی جلوہ گر دوسرا وینش کا نقشہ صاف آنا ہی نظر ہو وہ اک نیزنگ قدرت کا تماشا سرسبز	مملکت اتنی ہو جس کی اور عیت اس قدر ایسے سلطان بلند اقبال فرخ فال کو ہو کوئی داوی جہاں میں مہر کشمیر آج شہر ہو جو مرکز کشمیر مانسہرہ طلسم دیکھتے ہیں صبا میں جب اُس کا انکاس باغ شال مار جو رونق فراہو اس کپ
--	---

سہزہ و نسرتین و گل کی سرزمین کیسے اُسے

بصیرتہ حاشیہ صفحہ ۱۵۸ - ظاہر کرتا ہے کہ جس قدر تجارت سیاحت اور علوم و فنون کی ملک میں ترقی ہوتی جائے
 اُسی قدر یہاں کے باشندے ترک وطن اختیار کرتے جائیں گے اور اسی طرح رفتہ رفتہ ملک کے باشندوں کی
 تعداد ایک مناسب مقدار پر آٹھمے گی۔ اس بیان میں ایک اور بھی خلل ہے۔ اوپر کے شعر سے یہ
 ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کی مردم شماری زیادہ ہونے سے اس بات کا اندیشہ ہے کہ ہندوستان
 کی پیداوار ہندوستانوں کی خوراک کے لیے کافی نہ ہو اور اس سبب سے بہت سے لوگ بھوک سے مرے
 لگیں اس اندیشہ کو وہ اس طرح رفع کرتا ہے کہ جب قحط سالیوں میں لوگ بھوکے مرتے رہیں گے
 تو مردم شماری بڑھنے نہ پائے گی اور ملک کی پیداوار ملک والوں کو کافی ہوگی گویا بھوک سے مرنے

کا علاج بھوک ہی سے مرنا ہوتا ہے - ۱۲

۱۵ مرکز کشمیر مراد شہر سری نگر ہے ۱۱

صفحہ گیتی پہ یا خلد ہیں کیسے اُسے

سایہ افکن اس طرح ہیں ہو ہو اُس پر چنار زیرِ وبالِ اپنے پیچھے گھر قطار اندر قطار باغِ جنت کا نہ انساں کو ہے کچھ انتظار جا بجا گویا کھڑے ہیں دیو اور جن پہرہ دار سینہ گروں سے گویا بکل جائیں گے پار نقرئی پانی کی اُس کی پھر کوئی دیکھے بہار	فی المثل ٹختہ نمرود کا ہے وہاں اک سبز و زار جھیل کے چاروں طرف جس طرح آتے ہیں نظر حق بنانے سے غرض تیرے یہ ایو باغ نسیم چوٹیاں بت کی ہیں بچن نہیں لپی ہوئیں اُن کی فحوت اور بندگی کی نہیں کچھ انتہا روزِ رُشن میں جب اُن کا جھیل پر پڑتا ہوئیں
--	--

اور پھر جھڑ زنانِ سہ لقا کا ہر طرف
 راسنا آفت کا فتنہ کا بلا کا ہر طرف

تو نہیں دیتا جھٹکنے لیے طالب کو کہیں جہنم میں یہاں تہیا ہیں مکاں بہر کہیں پھر وہ عالم ہی جہاں غیر از خموشی کچھ نہیں ختم ہو جاتی ہے دنیا بھی یہاں آکر نہیں طاقتِ انساں کی حد سے ہیں پرو و نوں کہیں جس کی دنیا میں نہیں تمثیل کوئی دلنشیں	جنتِ امی کشمیر کوئی تجھ سی دنیا میں نہیں جہنم یا بھول سے اور پھل سے لالا مال ہے ان مکانوں اور خیابانوں سے جب آگے بڑھے جیسے ہوتا ہے ابد پر وقت جا کر منتی یعنی اقلیمِ ابد اور یہ جہاں خامشی طرفہ سنا ہے اس سُنساں کو ہستان پہ
---	--

ہیں سرِ سرِ ناپید آثارِ انسانی یہاں
 منہ پھیلے ہیں پڑے سرِ ایزدانی یہاں

ڈھوٹے گراں پہاڑوں کی بلندی کی بنا
 جیسے ادھی کی زین سے تافلاک پہنچے ہیں یہ
 ہر یقیں ستے ہی میں ہوجا کام اُن کا تمام
 ناپستی پر کے انگیزوں نے جب کھولی دکاں
 یعنی اُس دم تک سکھوں سے ہو اگر اگلا
 لشکرِ مقدونیہ کی قتل کا ہوں پر ہوا ۲
 بعد مدت گرم پھرن گامہ جنگ و جدال

اہل انگلستان کو جھگڑوں سے فرصت کم ملی
 اس کو فتنہ کے ہاتھوں سے فراغت کم ملی

جب بغاوت نے اٹھا یا ستر اُس سے بھی سوا
 عورتیں اور اُن کے بچے بے گنہ مارے گئے
 بجائی بندوں کی جفائیں دیکھ کر غلگس ہو
 اور نہاروں نے یہ باندھ لکے منصوبہ کہ بس
 صفحہ ہستی سے نام اُن کا مٹانے کے لیے
 لیکن اُن کی گھات میں تھا شخہ قہر و غضب
 آگ بھڑکی مرگ کی اور خون کا دریا بہا
 گھر جلے اور دشمن جاں ہو گئے خود دست و پا
 اہل انگلستان کے ساتھی تھے جو اہل وفا
 عزت انگلستان کی اب خاک میں دبے ملا
 ہو گیا تیار جان و دل سے ہر چھوٹا بڑا
 پھنس گئے پنجہ میں اُس کے یک بیک اہل خطا

پلہ انگلستان کا ہو کر رہا آخر گراں
 گرتے گرتے ختم گیا اقبال کا اُس کے نشاں

گروہنی دلی پہ حاصل بر ملا فتح و ظفر
 پرچم اقبال لہرانے لگا پھر بے خطر

پرنس اس فتح نمایاں کا ہوا اعلان کچھ
چو کا چم نکا اٹھنے لگے راتوں کو بدعادت لوگ
صبح کے ہوتے ہی سبکا فوج ہو جاتی تھیں وہ
راک یہ ٹھہری کہ پائے اب وہ قیصر کا لقب
وقت بازو سے جو حاصل کیا ہی تو م نے

تاکہ سب جاہلین کہ رخصت ہند سے فتنہ ہوا
عہد انگلستان کا جو کچھ کہ تھا پورا ہوا

اس نوید ریح پرور کی اشاعت کے لیے
ایلیٹ اور پرنس جس کے دودھ اقبال میں
جس کے دادا نے کیا زیر و برز نظم فرما
دی فرانسیسیوں کو حسین کہ وہ انگلستان
حاکم بوہیمیا کی چھین لی تھی جہیز ڈھال
جس پہ کلے اعتراف بندگ کے بر ملا

جمع تھے جس ذات والا میں فضائل اسقدر
وہ ہوا معمور اس کارِ عظیم الشان پر

وہ مبارک وقت جب لنکا سے لیکر تایلین
راگ لگائے جاتے تھے ہر سو مبارکباد کے
اُس کے آنے کی خوشی میں جو تھے سب مرد و زن
جوش شادی میں دو دو باتا تھے نعمہ زن

شہر میں جنگل میں ہر میدان میں راہیں جمع تھی اُس کے لیے خلقِ انجمن در انجمن
 وہ سہنا بول شہنا کے وہ باجوں کی جھڑی پڑھی ہون کی گویا کان میں سہاگ بھرن
 کچھ چلے ہیں اُس ہایوں جشن کے نقشہ بہت میں بھی اب وکتور یا اور خرنشایانِ زمن
 چاہتا ہوں کھینچا خاکا اک اُس در بار کا جس میں کی تو نے قباۃِ قیصری نہیں

جس میں تیرے نام کا ڈنکا بجایا تو م نے
 جو کہا تھا منہ سے آخر کو دکھایا تو م نے

عَمِ شَبَلِی وَا تَمِ حَالِی

(از احسن مارہروی)

رخصت ای صبر اگر جس جبر کی اتنا نہیں طبعِ عیش نہیں آرزوئے خواب نہیں
 جمع کیا کیا عَمِ داندوہ کے اسباب نہیں دل مضطرب نہیں دیدہ غولاب نہیں

خانۂ عیش میں بربادی و ویرانی ہے
 آج مجھوئے خاطر کی پریشانی ہے

کوئی سامانِ فرغت نہیں حسبِ دلخواہ گھر ویران تو گھر والے ہیں برباد و تباہ
 اس طرف ملک میں ہیں قحط و باشام و پگاہ اس طرف قوم میں فقدانِ کمال آہ صد آہ
 جبے خوش بختی و اقبال نے منہ پھیرا ہے

ہر طرف سے غم وادبار نے آگھیرا ہے

آج سے چند صدی قبل کی مُسنے حالت نہ یہ ادبار کا نقشہ تھا نہ غم کی صورت
کالِ تجاربِ کاہتی عیش کی بڑبھتی لبت اور پھر علم و کمالات کی شان و شوکت

کوی مفلس نظر آتا تھا نہ جاہل کو می

تھا نہ اُس عہد کا بے فکر بھی جاہل کو می

فارغ البال تھے اس عہد میں اہل کمال آب و حوض کی نہ گرائی تھی نہ تھا قحطِ حلال
جس کو دیکھو نظر آتا تھا نہایت خوشحال عیش و عشرت کے سوا پاس نہ تھا بچ و ملال

بالکمالوں کی یہ کثرت تھی زمانے بھر میں

جمع ہوتے تھے دس دس کبھی ایک ایک گھر میں

اکبری عہد کی تاریخ ہی دیکھیں ہم اگر سیکڑوں آئیں نظر اہل کمال اہل مہر
سن کا اُس وقت میں ثانی تھا نہ کوئی مہر فرد و اپنے کمالات میں تھی نام آور

دھوم تھی ہند سے ایرانِ عرب تک سب کی

جب تو جب عزت و توقیر ہر اب تک سب کی

ملک بھر کے کملا کا تو ہے دشوار شمار ایک کوزے میں سماتا نہیں بحرِ ذخار
ہر مناسب کہ نمونے کے لیے ہوں اظہار صرف وہ نام جو تھے زینتِ شاہی دربار

صورتِ ترجمہ اسلاف کی تحریریں ہیں

اکبر و عہدِ جہاں گیر کی تصویریں ہیں

خانِ جاناں ابوالفضل و ضمیری عری
دکنی خواجہ خدادند و صبوحی فیضی
میرزا جعفر و ہشام و محمد بختی
ملک قتی و ملا حسین نقشی

میر فتح اللہ شیرازی و قاضی کمال
حاجی افضل و شکیں رقم و شیخ جلال

طالبِ املی و شیخ سلیم چشتی
حافظ رخنہ و نور اللہ و قاسم علوی
نور دین شیخ مبارک، شہ عارف نامی
شمس دین، خاں بابا، یوسف و اطاری

حضرت غوث و ضیاء اللہ و عبدالقادر
مشہدی، کوکہ۔ ابوالفتح۔ رفیع شاعر

۱۰ اکبر اور جہاں گیر کے درباریوں میں یہ خطاب تین آدمیوں کا تھا (۱) بیرم خاں جو بہاولوں کے عہد سے
و البتہ دربار تھا المتوفی ۹۶۶ھ (۲) منعم خاں پسر بیرم خاں المتوفی ۹۸۳ھ (۳) عبد الرحیم خاں
المتوفی ۱۰۳۶ھ ۱۱ شیخ ابوالفضل دربار اکبری کا مشہور علامہ المتوفی ۱۰۸۵ھ ۱۲ مولانا
نظام الدین ضمیری بگڑامی المتوفی ۱۰۸۵ھ ۱۳ مولانا جمال الدین عری المتوفی ۱۰۸۵ھ ۱۴ خواجہ
خدادند دکنی اکبری دربار کا ڈیڑھ ہزاری منصب دار المتوفی ۹۹۵ھ ۱۵ صبوحی المتوفی ۹۹۲ھ
۱۶ شیخ ابوالفضل فیضی المتوفی ۱۰۰۴ھ ۱۷ میرزا جعفر قزوینی الخاطب بہ آصف خاں وزیر جہانگیر
المتوفی ۱۰۸۵ھ ۱۸ اصل نام بہاولوں تھا گھر دربار اکبری میں حکیم جام نام تھا المتوفی ۱۰۸۵ھ ۱۹
محمد بختی المتوفی ۹۹۹ھ ۲۰ ملک قتی مشہور شاعر المتوفی ۱۰۲۵ھ (بقیہ نوٹ صفحہ آئندہ پر)

بیگ خان دی شیخ احمد الف ثانی شیخ عبدالنبی و شیخ گدائی بجشی
میرزا شاه رخ و عدل و حکیم مصری خان غازی و معالی و رفیع صفوی
ناصر الملک و علانی و شہ عبدالغفور
مرتضی خان جہاں خواجہ اینا منصور

(سلسلہ نورث صفحہ ۱۶۵) ۱۵۲ ملاحسین نقاشی مدرکن۔ ۱۵۳ المتوفی ۱۱۵۹ھ ۱۵۴ میر فتح الدمشیرازی
المتوفی ۱۱۵۹ھ ۱۵۵ قاضی ابوالفتح عرف قاضی کمال بلگرامی المتوفی ۱۱۵۹ھ ۱۵۶ حاجی افضل
بلگرامی المتوفی ۱۱۵۹ھ ۱۵۷ میر عبدالمدتر ندی مخاطب شکیں رقم المتوفی ۱۱۵۹ھ ۱۵۸ شیخ جلال
المتوفی ۱۱۵۹ھ ۱۵۹ ملک الشعر اعلیٰ المتوفی ۱۱۵۹ھ ۱۶۰ حضرت شیخ سلیم چشتی رحمہ مشہور
بزرگ المتوفی ۱۱۵۹ھ ۱۶۱ حافظ رختہ المتوفی ۱۱۵۹ھ ۱۶۲ قاضی میر نور الدمشق شستری المتوفی
۱۱۵۹ھ ۱۶۳ سید نجم الدین نام۔ ابوالقاسم کنیت۔ کاہی تخلص۔ المتوفی ۱۱۵۹ھ ۱۶۴ شیخ
وجہہ الدین گجراتی علوی المتوفی ۱۱۵۹ھ ۱۶۵ حکیم نور الدین التخلص بہ قراری المتوفی ۱۱۵۹ھ ۱۶۶
مبارک الدمشق شیخ مبارک والد فیضی ابوالفضل المتوفی ۱۱۵۹ھ ۱۶۷ شاہ عارف حسینی المتوفی
۱۱۵۹ھ ۱۶۸ حکیم ملک شمس الدین بیلانی المتوفی ۱۱۵۹ھ ۱۶۹ امیر الامرا خان زمان علی قلی خان
سیستانی المتوفی ۱۱۵۹ھ ۱۷۰ محمد یوسف درباری اکبر المتوفی ۱۱۵۹ھ ۱۷۱ ملا علی محبت طاری تخلص
المتوفی ۱۱۵۹ھ ۱۷۲ سید محمد غوث گو یاری المتوفی ۱۱۵۹ھ ۱۷۳ شیخ ضیاء الدمشق المتوفی ۱۱۵۹ھ
۱۷۴ ملا شیخ عبدالقادر بدایونی المتوفی ۱۱۵۹ھ ۱۷۵ ملک الشعر امولانا غازی مشدی المتوفی ۱۱۵۹ھ (میرزا نورث صفحہ ۱۶۵ پر)

اکثران میں ہیں ہی نام جو تھے درباری جن کو اکبر سے عنایت ہوئی منصب داری
اہل دربار کی فہرست نہیں یہ ساری سب گئے جائیں تو ہو جائے کتاب اک بھاری
ہر فقط اسم شماری یہ نمونے کے بطور
ورنہ درباریوں کے نام ہیں باقی ابھی اور

(سلسلہ نوٹ صفحہ ۱۶۶) ۳۵۳ھ مرزا عزیز کو کہ مخاطب با غلام خاں المتوفی ۳۳۳ھ ۳۵۳ھ سیح الدین
حکیم البرافغ نیلائی برادر حکیم ہام المتوفی ۹۹۴ھ ۳۵۴ھ رفیع الدین نام - دکن وطن - شاعر دربار اکبر
المتوفی ۳۵۴ھ تروی بیگ خاں ترکستانی بہایوں کے حمد سے وابستہ دربار تھے۔
۳۵۵ھ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی مشہور بزرگ المتوفی ۳۵۵ھ ۳۵۵ھ شیخ عبداللہ بنی المتوفی
۹۹۵ھ ۳۵۵ھ شیخ گد الی کبیرہ المتوفی ۳۵۵ھ ۳۵۵ھ شیخ نظام الدین احمد المتخلص بنجشی صاحب
طاعات اکبری ۳۵۵ھ میرزا شاہ رخ المتوفی ۳۵۵ھ ۳۵۵ھ سید محمد میر عدل علاقہ سنبھل
کے رہنے والے تھے المتوفی ۹۹۶ھ ۳۵۵ھ حکیم مصری دکنی شاہی طبیب ۳۵۵ھ قاضی نظام بخشی
مخاطب بہ غازی خاں المتوفی ۹۹۶ھ ۳۵۴ھ شاہ ابوالعالی خواجگان کاشغر کے گھرانے سے تھے
المتوفی ۹۹۶ھ ۳۵۵ھ سید رفیع الدین صفوی بہایوں کے درباری تھے ۳۵۴ھ ناصر الملک ملا
پیر محمد خاں اکبر کے درباری تھے ۳۵۵ھ شیخ علائی صوبہ بنگال کے ساکن المتوفی ۹۹۶ھ ۳۵۵ھ
شاہ عبدالغفور عرف بابا پکیر اکبری عہد کے محبوب تھے المتوفی ۹۹۹ھ ۳۵۵ھ پیر رافعی شریانی
سید شریعت جرجانی کی اولاد میں تھے ۹۹۶ھ ۳۵۵ھ تاک زندہ تھے (بقیہ نوٹ صفحہ آئندہ پر)

سب کے سب نہیں تھے نام آور و حوا اقبال
سب کے اوصاف کی تشریح ہو اٹل خیال
بدرِ کامل کوئی تھا کوئی تھا خورشیدِ کمال
مختصر یہی انھیں سے تھا سب اکبر کا جلال

شاہِ گران میں نہ تھا کوئی تو جرت کیا ہے
شاہِ گرجے تھے تو پھر اور حقیقت کیا ہے

اک وہ تھا عہدِ قدیم ایک یہ ہی عصرِ جدید
جامہٴ کُننہ کی یکِ نخت ہو ی قطع و برید
نہ وہ تعلیم و تعلیم ہی نہ وہ گفت و شنید
ہی ہر اک رنگ ہر اک بات میں گو یا تجرید
ایشیائی روش و طرز کے انداز نہیں
وہ ترانے نہیں وہ دُھن نہیں وہ ساز نہیں

نہ وہ عالم نہ وہ علم اور نہ وہ شانِ تعلیم
نہ وہ مکتب نہ وہ حافظہ نہ میاں جی نہ حکیم
نہ وہ شاعر نہ وہ اشعار نہ وہ طبعِ سلیم
مٹ گئیں صفحہٴ عالم سے لقنا ویرِ قدیم
نہ وہ بیخا نہ میکش ہیں نہ وہ سانی تہر
بس اک اللہ کا ہی نام کہ وہ باقی ہے

دیکھ لی ایک صدی کی یہ ترقی یہ بہار
اب ذرا ایک صدی کا ہونٹنزل بھی شمار

(سلسلہ نوٹ صفحہ ۶۷) بعد وفات امیر خنہ و دہلوی کے جوار میں دفن ہوئے ۵۳۳ھ حسین علی خان، خانِ جہاں، سیرِ غلام

خانِ فاناں کا بھائی المتوفی ۵۹۵ھ ۵۵۴ھ خواجہ امین الدین تبریزی مشہور خواجہ امینا مخاطب بہ خواجہ جہاں۔ المتوفی

۵۹۳ھ ۵۵۴ھ خواجہ منصور المتوفی ۵۹۹ھ (ماخوذ از دربارِ اکبری و مفتاح التواریخ)

تیرھویں پھلی صدی میں جنے تھے دوپٹا ہو گئے راہی فردوس مٹے سب آثار
نام اُن نامیوں کے آج سنائیں کن کو
اجنبی لوگ نظر آتے ہیں دیکھو جن کو

یادگار اُن کی جو شخص تھے فرزند خصال اُن کو بھی کھا گئی موت اٹھ کر وہ بھی خصال
وہ اٹھے کیا کہ ہوا خاتمہ فضل و کمال جانشین اُن کے کوئی یہ ہر خام خیال

ہائے اک ساتھ گئے شبلی و حالی دونوں
کر گئے محکومہ علم کو خالی دونوں

فلکِ علم کے شمس العلماء تھے دونوں ملکِ شہرت کے رئیس العرفاء تھے دونوں
کیا زمانے کو بتائے کوئی کیا تھے دونوں جن کا تانی نہیں ایسے کُلا تھے دونوں

یادگارِ سلف ایسے نظر آنے کے نہیں
جو ہیں وہ نہضِ شناس اپنے زمانے کے نہیں

ان کی خدات ہیں مثلِ مہتاباں روشن کون واقت نہیں اس سے کہ وہ کامل فن
کیا کلام اُن کے کمالوں میں کریں اہل سخن پاچکا حسنِ قبل اُن کا ہر اک فعل حسن
کب وہ بیکار کوئی کام کیا کرتے تھے
رات دن خدمتِ اسلام کیا کرتے تھے

ابھی شبلی کا کفن بھی نہ ہوا تھا میلا دامِ صیادِ اجل کا نئے سرے سے پھیلا
لے چلا بھر کے وہ فتر اک اپنے تھپلا کر گئے حضرتِ حالی بھی قصداً داہلا

چھپ گئے شمس و قمر بچیں ماتم کی صفوف
ہو گیا ڈیرہ مہینہ میں کسوف اور خسوف

کوئی پوشیدہ و مخفی نہیں حالِ حالی حال کے ساتھ ہی وابستہ مقالِ حالی
صورتِ بدرِ بحرِ خست نہ کمالِ حالی آج دنیا میں نہیں کوئی مثالِ حالی
دل ہی پمردہ طبیعت میں بجالی نہ رہی
خاک بنتی کہ یہاں صورتِ حالی نہ رہی



بیٹی کی محبت

(نور الدین کبوتری)

جب سرایہ وطن سے شہرِ ابرار چلے سرفروشی کو شہادت کے خریدار چلے
کتی تھی فاطمہ صغرا کہ ہمیں مار چلے لومسیا بھی تجھے چھوڑ کے بیمار چلے
ساتھ اماں کے نہ ہمراہ پڑ جاتی ہوں
لوگوں تلوؤ تو میں کیوں نہیں مر جاتی ہوں
جبشِ دیں کو دیا موت نے پیغامِ سفر گرمیہ آغاز کیا سوچ کے انجامِ سفر
آگے صغرا کے کسی نے نہ لیا نامِ سفر گھر میں ہنگامہ عشر ہوا ہنگامِ سفر

شور تھا قبر میں محبوبِ خدا روتے ہیں

یوطن آج حسینؑ ابنِ علیؑ ہوتے ہیں

منزلِ گور کا حضرت نے جو سامان کیا گھر کو بر باد کیا، شہر کو ویران کیا
بولی صغرا مجھے اس کوچ نے بجان کیا میرے آزار پہ عیسیٰ نے نہ کچھ دھیان کیا

بے اجل آج مونی رنج کے مارے صغرا

چھٹکے بابا سے ہوئی گور کنارے صغرا

ہاتھ پکڑے ہوئے اکبر کا ہیں بابا تیار بھیا اصغر کو لیے ہو گئیں اماں بھی سوار
یہ نہ جانا ہر دم سے لگی اک ہمار روکے مجرا تو لیا اور نہ کہا بر خور دار

ٹھہراے صاحبو ٹھہرو، مجھے آ لینے دو

بھیا اصغر کو کبھی سے لگا لینے دو

ساربانوں سے گواؤں تپوں کو ٹھہراؤ ذرا ناتوانی پر مری رحم کرو بہر خدا
تم کو ہر چند ہر ملنے کی مرے کیا پروا میری آواز سے بیزار ہو، صورت سے نہ خفا

جلد اس طرح سے تشریف لیے جاتے ہو

آج گویا کہ مجھے دفن کیے جاتے ہو

مجھ سے بے آس ہو تم مجھ کو شفا کا ہوشیں اور جو دم نکلتے ثواب باپ کے آگے آئیں
ورنہ ایسی بھی تو بچار نہیں میں غمگین گرتی پڑتی ہوئی تم پاس میں آئی کہ نہیں
بھائی کے بیاہ کا میں کام کرونگی لوگو

دیکھ کر سہرا میں اکبر کا مردنگی لوگو
 مجھ کو الفت ہی تمھاری تھیں الفت نہیں ساتھ دوڑوں جو سواری کے سوتا ہی نہیں
 اماں لیں گود میں ایسی ہی قیمت نہیں پیا آجائے پدر کو سو یہ صورت ہی نہیں
 لونڈیاں ساتھ چلیں آج غریزوں کی طرح
 مین جی بیٹی تھی رہی گھر میں کنیزوں کی طرح
 جس نے چلنے کو کہا سب سے کہا بسم ہر مجھ سے جھوٹوں بھی نہ پوچھائیں گنہگار تھی آہ
 گز خطا ہی یہ خطا ہی، جو گنہ ہی یہ گنہ ان دنوں شدت تپ سے مری حالت ہی تباہ
 یہی نہ، دود و پریش میں پڑی رہتی ہوں
 اب تو ہنسیا رہوں چلنے کے لیے کہتی ہوں
 بیٹھے بیٹھے مرا اس وقت کا چلنا دیکھو گزنا بیباختہ، مشکل سے سنبھلنا دیکھو
 تپ میں کیا دیکھا تھا ابل کا اچھلنا دیکھو ہاتھ میں بانہتی ہوں ہاتھوں کل ملنا دیکھو
 ردی آنکھوں کی ترپ دکلی دھڑک سینے کی
 سب یہ چلنے کی باتیں ہیں ویا جینے کی
 ایک بیک میرے مقدّر کا بگڑنا دیکھو پائل پڑتی ہوں مرا پاؤں رگڑنا دیکھو
 سانس کا بات کے کہنے میں اکھڑنا دیکھو حال یہ، اُس پہ غریزوں کا بچھڑنا دیکھو
 غیر بھی ایسے غریزوں کو نہ تنہا چھوڑیں
 چھف ہی بیٹی کو اس وقت میں بابا چھوڑیں

یہ تو اس کے سچے اب ہو گیا صغرا کو فقیں باپ کے ہاتھ کی مٹی مرثیت میں نہیں
سب کو بابائے مرثیہ سواریاں ہیں مجھ کو تابوت ہی چھڑا سا منگا دیں

بعد مرنے کے لب گور جو جائے صغرا

باپ کے ہاتھ کا تابوت تو پائے صغرا

آہ الزام سے خالی نہیں مرنا بھی مرا بھینا اکبر کا نہ بیاہ ایک برتن کا ہوگا
پر مرا سوگ بھی کا ہے کو کوئی رکھنے کا لاڈلی کسی ہوں اور کسی ہو بیاری میں بھلا

کیوں سبک سمجھے نہ ہر ایک مجھ آزادی کو

طول ساطول کھنچا ہی مری بیماری کو

میں نے چاہا تھا کہ دکھلاؤں یہ حال زبوں جاؤں در پر بھی نہ زحمت کے لیے میں خزانوں
پھر یہ سوچی کہ حقیر اور بھی کنبے میں نہوں بات ہی جب نہ کوئی پوچھے تو کس سے روٹوں

متوجہ جو کسی کو میں نہیں پاتی ہوں

آپ ہی روٹھتی ہوں آپ ہی من جاتی ہوں

ہاں اب میں ہوں یہ تنہائی ہی اور سونا گھر نہ خبر مجھ کو مختاری نہ محقق میری خبر
دل کے بھلانے کو تم سب کے ہیں بھیا صغرا خالی جھولے سے میں ٹکراؤنگی یاں اپنا سر

الفقیں دیکھ کے ایک ایک کی میں سیر ہوئی

ہائے اللہ مری موت میں کیوں دیر ہوئی

شبابِ شیب

(از حضرت بیخود بدایونی)

اسے وہ سخن چمن وہ گلر خوں کے جھمکے

وہ جوانی جس کو کہتے ہیں دوانی ہوشیار

وہ گلوں کے ٹپتے وہ لہلوں کے پیچھے

تبسم و گل کا وہ عالم وہ فضا کے سبزہ زار
رو کے جاناں کا وہ جلوہ چاندنی کا وہ سماں

زلف خوش خم کا وہ خم وہ چشم میگوں کا خار

شوخی چشمک رہزنِ عبر و شکیب و ہوشِ تاب

تیکھی چوینِ دشمنِ جان و دل و غبط و ترار

وہ ادائے ناز کی ناز آفرینی دم بدم

وہ نگاہِ شرم کا جھکنا جیا سے بار بار

وہ چھپا ناروے روشن کا ستارے کو مرے

وہ تسلی کے لیے مجھ سے ہی ہو جانا دو چار

وہ نگاہِ شوخ جس سے فتنہ محشرِ خجل

وہ حزامِ ناز جس سے خود قیامتِ شرمسار

وہ لب جو وہ لب پیمانہ وہ لب ہائے دوست
 وہ بھوم اشتیاق و حسرت پس و کنار
 وہ گلے شکوے وہ پیمان وفا وہ چھیڑ چھاڑ
 وہ مرے ملنے سے ہنس نہیں کھتا ناٹک و عار
 وہ طرب افزا نوازے مطرب و آہنگ نے
 وہ نشاط انگیز دور رس غزو و وصل بکار
 وہ سہانی رات وہ خلوت کدہ وہ ولولے
 وہ ترنگیں وہ اُنکیں وہ مر و رہے شمار
 وہ ہم آغوشی کی لذت وہ شکر خواب وصال
 تازگی بخش مشام جان و زلف مشک بار
 وہ دمِ حضرت دلِ بیتاب کی بیتابیاں
 جاتے جاتے وہ کسی کا شرم سے قتل و قرار
 اب کہاں وہ صحبتیں وہ لطفِ شبِ کاشاب
 اب تو ہی چاروں طرف سے صبح پیری آشکار
 اب کہاں وہ حسرت دیدار کا دل میں بھوم
 اب کہاں وہ رات دن جوش جنوں سر پہ سوار
 اب کہاں وہ اعتبارِ ضبط آہ و جذبِ دل

اب کہاں وہ اعتمادِ نالہ بے اختیار

اب کہاں الفت کے وہ نیزنگ جن کے دم سے بھتی

آہ سوزاں برقِ افکن چشمِ گریاں و جملہ بار

اب تو ہر فصلِ بہاراں میری آنکھوں میں خزاں

اب تو گلِ نئے چمنِ میری نگاہوں میں ہیں خار

خواب ہی بھولا ہوا سا اب تو لطفِ زندگی

بے مزہ سا اب تو افسانہ ہے ذکرِ وصلِ یار

اب تو ثروت میں مزہ بخود نہ لذتِ وصل میں

اب تو وعدے کی تمنا ہی نہ رہی انتظار

اب تو بس باقی ہے اتنا دل لگی کا مشغلہ

اب تو بس اس پر ہی اپنی زلیست کا دار و مدار

جستجوئے وقتِ رفتہ اور چشمِ خوں چکاں

ما تم عمر گزشتہ اور دستِ عرشہ دار



بادشاہ کے ہاتھی اور گھوڑے کی تعریف

(از حضرت ذوق دہلوی)

اُٹھ گیا مدرسہ دہر سے یہ شہر و شفق
 زید سے عمر کے دل میں نہیں باقی ہر نفاق
 چرخ کے گنبدِ بے در میں رہیں گے مجبوس
 دم نہ مایں گے مگر گونج کے شور و شلتان
 گر لکھوں وصف ترے اسپ جہاں گرد کا میں
 دے فلک ازپے پا مال قلمِ ہفت اوراق
 تن میں اس طرح سے ہر اس کے پھڑکتی شوخی
 نفسِ تن میں ہو جوں طائرِ جانِ عشاق
 ماہی زیرِ زمین لوٹ کے ہو جائے کہاں
 جھاڑے گریں گاہ پہ وہ نعل سے اپنے چھان
 وقت کو باندھ کے فتر اک میں را کب اس کا
 چرخ پر دائرے کھینچا کرے مانند نطاق
 اُس فلک سیر کو گلشت میں گر تو شاہا
 جہدِ طبع کی جنبش کا چھو اوے مطراق

یوں اڑے سوئے فلک جیسے بہ تفریحِ مشام
 بوئے گل جائے تنفس میں دم استنشاق
 کیا لکھوں وصفِ تیرے میلِ فلک پیکر کا
 کہ گر انباری ہے اُس کی تن البرز پہ شاق
 عمر بھر مطبوعِ عالی میں رہا نعمتِ خواں
 صفۃِ اطعمہ پر خام رہا جوں بسحق
 ہیں ستاروں کی بھی آنکھیں انہی ہاتھوں کی گلیں
 نورِ ہمت کا زمانہ میں جو ہے عامِ انفاق
 بزمِ دشمنِ پاکیش بہنگامِ وغنا
 گرفتار ہوئے جلوریز بہ دشتِ قہچاق
 تو عجب کیا ہے کہ اُس کشورِ برفانی میں
 شعلہ تیغِ شرار بار ہو برقِ حراق
 دل مرا ہو گیا اس وقت ہے وہ عالمِ نور
 جس کی مشرق سے کریں نورِ معانی اشراق
 کردہ صادقِ ارادت سے کہ ہر وقت دعا
 کیوں خموشی پہ کیا ذوقِ زباں کو مشاق
 دوشِ گردوں پہ ہوتا فرغلِ سنجابِ عنام

سبزہ تا خاک پہ ہو پیرا ہن استبراق
 دختِ رز کو بہ بہرِ محفلِ اہل تقویٰ
 جب تلک سینہٴ مینا میں رہے دردِ فراق
 تجھ کو آفاق میں ہو دے مضاں بھی امہ عید
 ہو ترے رویت دیدار پہ عیدِ آفاق
 اور ترے نیرِ اقبال کے آگے دشمن
 یوں رہے جیسے کہ ہوا ماہِ بایامِ محاق
 صفحہٴ دہر سے پھر گردِ دشمنِ افلاک اسے
 حرفِ باطل کی طرح دیوے جہاں سے اذہاق

رباعیات

(از مولانا حالی مرحوم)

نینکی اور بدی پاس پاس ہیں

جو لوگ ہیں نیکوں میں مشہور بہت
 ہوں نیکوں پر اپنی نہ مغرور بہت
 نینکی ہی خود اک بدی ہے، گر ہونہ خلویں
 نینکی سے بدی نہیں ہے کچھ دور بہت



شراب اور جوانی

ہو بادہ کشی پر نہ جوانو مفتوں
گردن پہ نہ لو عقلِ خدا داد کا خول
خود عہدِ شباب اک جنوں ہی۔ اب تم
کرتے ہو جنوں پہ اک اور جنوں

غروبِ عیبوں سے بدتر ہو

مکن نہیں یہ کہ ہو بشرِ عیبِ دور
پر عیب سے بچئے تا بمقدور ضرور
عیب اپنے گٹھاؤ۔ پر جنر دار رہو
گھٹنے سے کہیں اُن کے نہ بڑھ جا غور

غرض

ہو نفس میں انسان کے جہلی یہ مرض
ہر سہی پہ ہوتا ہے طلبِ کارِ عوض
جو خاص خدا کے لیے تھے کام کیے
دیکھا تو نہاں اُنہیں بھی مٹی کوئی غرض

جس کو زندگانی کا بھروسہ نہیں وہ کوئی بُرا کام نہیں کر سکتا

دنیا کو ہمیشہ نقشِ نسانی سمجھو
رودادِ جہاں کو اک کہانی سمجھو

ہر سانس کو عمر جاودانی سمجھو	ہر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا
	آثارِ زوال
اولاد کو سستی پتلاعت کا گن ہیں ایسے گھرانے کوئی دن کے مہاں	آبا کو زمین و ملک پر اطمینان بچے آوارہ اور بے کار جوان
	شانِ ادبار
برسات میں سبزہ کا نہ تھا جس پہ نشاں یاد آئی ہمیں قوم کے ادبار کی شان	صحرا میں جو پایا ایک چٹیل میدان مایوس تھے جس کے جو تنے سے دھتلاں
	مکروریا
خطرہ انھیں گرگ کا نہ ڈر شیروں کا بھیڑوں کے لباس میں ہیں جلوہ نما	حالی رہ راست جو کہ چلتے ہیں سدا لیکن ان بھیڑیوں سے واجب ہر حذر
	جو ہر قابلیت
پوشیدہ ہیں ویشیوں میں اکثر انساں ہیں طوسی و رازی انھیں شکلوں میں نہاں	ہیں بے مہروں میں قابلیت کے نشاں عاری ہیں لباسِ تربیت سے ورنہ

علم

اے علم کلیدِ گنجِ شادی تو ہی
انسا پیشِ دو جہاں ہی سایہ میں رہے
سرچشمہ لغاؤ آیادی تو ہے
دنیا کا وسیلہ میں کاہدی تو ہے

عزت کس چیز میں ہے

دولت نے کیا مجھے ہی عزت ہو جہاں
عزت بولی غلط ہو دونوں کا بیاں
فرمایا ہنر نے میں عزت کا نشان
میں بھید ہوں حق کا جو ہر نیکی میں نہاں

عفو یا وجودِ قدرتِ انتقام

موسیٰ نے یہ کی عرض کہ اے بارِ خدا
ارشاد ہوا بندہ ہمارا وہ ہے
مقبول تر کون ہو بندوں میں سوا
جو لے سکے۔ اور نہ لے بدی کا بدلا

تنزلِ اہلِ اسلام

پستی کا کوئی سجد سے گزرنادیکھے
پستی کا کوئی سجد سے گزرنادیکھے
اسلام کا اگر کر نہ ابھرنادیکھے
دیر کا ہمارے ہوا تر نادیکھے

چند عجیب بہت سی خوبیوں کو نہیں ٹٹا سکتے

موجود ہنرمیوں ذات میں جسکی ہزار
باطن نہو عجیب اُسیں اگر ہوں دوپٹا
طاؤس کے پائے زشت پر کر کے نظر
کر حُسن و جمال کا نہ اُس کے انکار

بڑھاپے میں موت کے لیے تیار رہنا چاہیے

کی طاعتِ نفس میں بہت عمر بسر
انجام کی رکھی نہ جوانی میں خبر
کیفیتِ شب اٹھا چکے۔ اب جالی
مجلس کرو برخواست۔ ہوا وقتِ سحر

دولت میں ثابت قدم رہنا بہت مشکل ہے

ڈرہی کہ پڑے نہ ہاتھ دل سے دھونا
زر و دار ذرا سوچ سمجھ کر ہونا
جس طرح کہ سونے کی کسوٹی ہو محاک
ہو جو ہر انساں کی کسوٹی سونا

کھانا بغیر بھوک کے مزا نہیں دیتا

کھانے تو بہت میسر آئے ہیں میں
جو دیکھ کے چکھ کے۔ دل بھائی میں
پر سب سے لذیذ تھے وہ کھا کر بھوک
جو تو نے کبھی کبھی کھلائے ہیں میں



قانون بد اخلاقی سے مانع نہیں ہوتے

حاشا کہ ہوان پہ نظم عالم کا مدار
اور بد نہیں بنتے نیک اس سے زہنار

قانون ہیں بیشتر یقیناً بیکار
جونیک ہیں اُن کو نہیں حاجت انکی

انسان اپنے عیب اپنے سے بھی چھپاتا ہے

اور جیسا سمجھتا ہوں نہ ویسا ہوں میں
بس مجھ کو بھی معلوم ہے جیسا ہوں میں

جیسا نظر آتا ہوں نہ ایسا ہوں میں
اپنے سے بھی عیب ہوں چھپاتا اپنے

رباعیات وقطعا کبر

غفلت ہی میں آدمی کو ڈوبا پایا
کم تھیں بخدا کہ جن کو بینا پایا

کیا تم سے کہیں جہان کو کیا پایا
آنکھیں تو بے شمار دیکھیں لیکن

عیاشی ہر بدی کے پے کا دھرا
گستاخ مگر خوشامدی سے بھی بُرا

رشوت ہر گلوے نیک نامی کا چھرا
ہر چند کہ نلے محل خوشامد ہر بُری



شرمندہ ہو دل میں وہ گنگار اچھا واللہ کہ بے حیا سے مکار اچھا	آزاد سے دین کا گرفتار اچھا ہرچند کہ زور بھی ہو اک خصلت بد
ذلت ہو دراصل جاہ و شوکت کی تلاش محنت میں کر سکون راحت کی تلاش	بے سووہر گنج و مال بوی کی تلاش اکبر تو سر طبع کو علم میں ڈھونڈھ
حرف جو ہو غافل ایسے غافل سے نہ مل جائزہ ہو کہ اُن سے مل نہ کر دل سے نہ مل	بے غیرت و خود فروش و جاہل سے نہ مل یک جا کر دین حوادثِ دہر اگر
باز وینکت نہیں تو عزت بھی نہیں مذہب جو نہیں تو آدمیت بھی نہیں	گر حیب میں نہیں تو راحت بھی نہیں گر علم نہیں تو زور و زہر ہے بیکار
امید اچھی خیال اچھا رکھو اکبر اللہ پر بھروسہ رکھو	خاطر مضبوط دل تو انا رکھو ہو جائیں گی مشکلیں تمہاری آسان
اپنی اپنی روش پر تم نیک رہو موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو	کتا ہوں میں ہندو مسلمان سے ہی لاٹھی ہی ہو اسے دہڑ پانی بن جاؤ

راحت ہو نصیب ثنائی شوکت نہ سہی دربار میں باہمی رقابت نہ سہی	رفہری مل جائے مال و دولت نہ سہی گھربا میں خوش رہیں عزیزوں کے ساتھ
لیکن مرے دل سے یہ صدا آتی ہے اور شکریہ ہے کہ موت آ جاتی ہے	ہنگامہ شکر و شکوہ دنیا میں ہر گرم گھلتا نہیں راز و ہر شکوہ ہر تو یہ
لذت وہ ہے کہ جوش صحت سے ملے عزت وہ ہے جو اپنی ملت سے ملے	دولت وہ ہے جو عقل و محنت سے ملے ایمان کا ہو نور و لمیں وہ راحت ہے
اک جداد ہر ایک سرکار میں ہے پہلے تھانویں اور اب نار میں ہے	سینے مکت جو میری گفتاریں ہے پروانے نے شمع سے لپٹنا چاہا
دشوار انسان کو ضبط ہو جاتا ہے اکثر ہی یہی کہ خبط ہو جاتا ہے	شیطان سے دکنو ربط ہو جاتا ہے حد سے جو سوا ہو حرص یا خود بینی
دنیا کی جس کو شرم ہی مرد شریف ہے فطرت میں وہ رفیل ہی دل کا کثیف ہے	جس کو خدا سے شرم ہی وہ ہی بزرگ ذلیل جب کو کسی کی شرم نہیں اس کو کیا کہوں

خلق جو کہیں ذلیل ہو جاتی ہے گو جسم میں ظاہر اتوانائی ہو	بے غیرت بے دلیل ہو جاتی ہے اخلاق میں وہ علیل ہو جاتی ہے
دنیا کو بہت ذلیل پایا میں نے اخلاقی پہلوؤں سے جانچا اکبر	بے غیرت و بے دلیل پایا میں نے شدت سے اُسے علیل پایا میں نے
افسوس سفید ہو گئے بال ترے تو زلفِ بتاں بنا ہو اہیاب تک	لیکن پیسہ اب بھی اعمال ترے دنیا پہ ہنوز پڑتے ہیں جال ترے
مذہبِ قانون و عزم کا بانی ہے تو ہیں ایک دوسر کی کرتے ہیں جو لوگ	خالص طاقت عروج روحانی ہے یہ جہل ہی یا ہوائے نفسانی ہے
انساں چاہے جو بات - رچھی چاہے شیطان سے وہ فلاسفی ہی مشوب	بیلوں سے مختار ہو نیکی چاہے جس کا مطلب ہی - کر وہ جو جی چاہے
اللہ کا حق اگر تلف ہوتا ہے	اس کے لیے کون سرکف ہوتا ہے

دنیا طلبی میں ہی یہ ہنگامہ وشور	حاصل پھر اس سے کیا شرف ہوتا ہے
انسان جو عمر ختم کر چکتا ہے	خوش ہو چکتا ہے آہ بھر چکتا ہے
فانی دنیا کا دیکھ لیتا ہی رنگ	زندہ جو رہا بھی وہ تو مر چکتا ہے
رُکتا نہیں انقلاب چار اکیا ہے	حیراں ہیں نمک، بشرِ بچار اکیا ہے
تسکیں کے لیے مگر ہی کافی یہ خیال	جو کچھ ہی خدا کا! ہمارا کیا ہے
مسکیں گدا ہو یا ہوشاہِ ذمی جاہ	بیماری و موت کہاں کس کو پناہ
ابھی جاتا ہی زندگی میں اک ثبوت	کرنا پڑتا ہے سب کو اللہ اللہ
تسبیح و دعا میں جس نے لذت پائی	اور ذکرِ خدا سے دل نے راحت پائی
کوئی نہیں غش نصیب اُس سے بڑھ کر	بس وہ نوجواں کی اُس نے نعمت پائی
ہو علم اگر نصیب تسلیم بھی کر	دولت جو ملے اُس کو تو تقسیم بھی کر
اللہ عطا کرے جو عظمت تجھ کو	جواہل ہیں اُس کے انکی تعظیم بھی کر

کنے سننے کی گرم بازاری ہے ایسا سینے کہ کنے والا ابھرے	مشکل ہو مگر اثر پرے دل میں ایسا کیے کہ بیٹھ جاے دل میں
جب لطف و کرم سے پیش آئے محبوب جب شل نسیم وہ گلے سے لگ جائے	اگلے ربخوں کو بھول جانا اچھا مانند کلی کے پھول جانا اچھا
اعمال کے خُسر سے سنورنا سیکھو مرنے سے منفرد نہیں ہو کر ابھر	اللہ سے نیک امید کرنا سیکھو بہتر ہو یہی خوشی سے مرنا سیکھو
اس عہد میں یہی ہو بس داخلِ نکوئی شوقِ عمل نہیں ہو فکرِ اجل نہیں ہو	نہیب پہ نکتہ چینی ملت کی عیب جئی ناصح بنے ہیں اکثر عابد نہیں ہو کوئی
غنچہ رہتا ہے دل گرفتہ پہلے کہنتی ہو نسیم آ کے رازِ فطرت	رنگِ چمنِ فنا سے گھبراتا ہے سنتے ہی پیامِ دوست لھلھاتا ہے
انسان یا بہت سے دلوں کو ملا سکے ہم تو اسی کو علم سمجھتے ہیں کام کا	یا کوئی شوقِ مفیدِ خلائق بنا سکے پڑھنے کو مستعد ہیں جو کوئی پڑھا سکے

ایک آرزو



دنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یا رب
 کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بُجھ گیا ہو
 شورش سے ہوں گریزاں دل ڈھونڈتا ہے میرا
 ایسا سکوت جس پر نقشِ پیر بھی فدا ہو
 مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری
 دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
 لذتِ سرو کی ہو چڑیوں کے چھوٹوں میں
 چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو
 آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبز
 پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو
 گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا
 ساغر ذرا سا گویا مجھ کو جہاں نما ہو
 صفتِ باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
 ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو

ہو دلفریب ایسا کُسار کا نظاں
 پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو
 ہندی لگائے سورج جب شام کی دُہن کو
 سرخی لیے سُندی ہر پھول کی قبا ہو
 راتوں کے چلنے والے رہ جائیں تھکے جس دم
 امید اُن کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو
 پچھلے پہر کی کوئل وہ صبح کی مؤذن
 میں اس کا ہم نوا ہوں وہ میری ہم نوا ہو
 کانوں پہ ہونہ میرے دیرو حرم کا احساں
 روزن ہی جھونپڑی کا مجھ کو سحر نا ہو
 پھولوں کو آئے جس دم شبِ نیم وضو کر لے
 رونا مراد وضو ہونا لہ مری دعا ہو
 دل کھول کر بہاؤں اپنے وطن پہ آنسو
 سرسبز جن کی نم سے بوٹا امید کا ہو
 اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے
 تاروں کے قافلے کو میری صدا اورا ہو
 ہر دم مند دل کو رونا میرا رلا وے

بیوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگا دے

رباعیات

(از حضرت بیخود بدایونی)

اور عقل پر پھولا ہے تو سودا ہی ہے
فورا ہی ابھرنے کی سزا پائی ہے

ناداں ہی اگر دعویٰ و انانی ہے
سرخس نے اٹھایا ہے بیاں مثلِ جبا

ہر دم غم، ہجران کی حکایت کیسی
اڑخانہ خراب، اچھر شکایت کیسی

بے مہر و سے امید عنایت کیسی
جب حاصلِ عشق جان کھونا ٹھہرا

کہتے ہو کہ حسرت بھی نکل جاتی ہے
بگڑی ہوئی قسمت بھی سمجھل جاتی ہے

کہتے ہو کہ عادت بھی بدل جاتی ہے
کنے ہی پر آگے تو یہ بھی کمد و

ذروں کو بھی آفتاب ہوتے دیکھا
اسمیں بھی نہ انقلاب ہوتے دیکھا

قطروں کو درخوش آب ہوتے دیکھا
لیکن صدیفِ حال زار بیخود



گذری ہوئی الفت کی یاد

(از نواب معطفہ خان شائستہ مرحوم)

روزِ غم میں کیا قیامت ہو شبِ عشرت کی یاد
 اشکِ خوں سے آگئیں زنجینیاں صحبت کی یاد
 میری حالت دیکھ تو نفسِ کتنی ہو چکی
 وصل کے دن و مہدم کیوں شیشہِ رعیت کی یاد
 میں ہوں بیکس اور بیکس پر ترجمہ ضرور
 حسنِ روزافزونِ دلا دینا مری حالت کی یاد
 طاقتِ جنبش نہیں اس حال پر قصدِ عدم
 مر گئے پر بھی رہے گی اپنی اس مہبت کی یاد
 غالباً ایامِ حراماں بجزوی میں کٹ گئے
 آتی ہو پھر آرزو بھولی ہوئی نرت کی یاد
 دل لگانے کا ارادہ پھر ہو شاید شیفہ
 ایسی حسرت سے جو ہو گذری ہوئی الفت کی یاد

غزل

(از حضرت شیفتہ)

صحابِ درد کو ہر عجب تیز می خیال
 مثل زبانِ نطقِ قلم کی زبانِ حال
 وعدہ وفا کیا ہے نہا ہیں گے اشکِ عبث
 وعدہ کیا ہے آئیں گے! بیجا ہے احتمال
 کیا کچھ وہاں سے منزلِ مقصود پاس ہے
 یا ایہا الذین سلکنتم علی الجبال
 ناز و غرور ٹھیک ہی جو رجفہ و جفا درست
 کس کو ہوا نصیب یہ حُسن اور یہ جمال
 ساقی پلا وہ بادہ کہ غفلت ہو آگہی
 مطرب سنا وہ نغمہ کہ ہو جس سے قالِ حال
 ہم اگلے عشق والوں کی تقلید کیوں کریں
 اے خوردہ گیرِ سخنِ رجال و ہم رجال
 اہل طریق کی بھی روش سب سے ہر الگ
 جتنا زیادہ شغل، زیادہ فراغِ بال

ہنگامِ عہدِ کام میں لائے وہ ایسے لفظ
جن کو معانی متعدد پر اشتمال
یہ بات تو غلط ہے کہ دیوانِ شریفہ ق ہر نسخہ معارف و مجموعہ کمال
لیکن مبالغہ تو ہے البتہ اس میں کم ہاں ذکرِ خد و خال اگر ہی تو خال خال

سرایا

(از مولوی جمال الدین حسن بدایونی)

نسبت الٰہی نکھول بادام کو دوس کیا مقدّر
عشق الٰہی نکھول کا ہے زنگِ شملہ کو ضرور
پہنچے انگور بنے جس سے مَنابِ طہور
دیدہ چشمِ کمبوتر بھی ہوا چکنا چور
کمد و آئینہ ذرا آنکھ چھپا کر دیکھے
نور کا عکس نہ دیکھا ہو تو آکر دیکھے
راست بینی سے مری چشم کا رتبہ ہی بلند
یہ وہ بینی ہے خدا میں جسے کرتے ہیں پسند
وصف بینی جو ہے در پیش تو دل پر خند
قصرِ پُروزِ سموات پھینکوں میں گند
نور سے بھی ہو کہیں رتبہ عالی اسپیں
دستِ قدرت نے عجب نوک نکالی اسپیں
مژدہ ای ببلِ سرگشتہ بُستانِ جمال
ہو مبارک تجھے گلگشتِ گلستانِ جمال

آئے آیام بہارِ چمنستانِ جمال یہ دکھاتے ہیں تجھے اب گلِ خندانِ حال
 لالہ گلشنِ جاوید دکھائیں تجھ کو
 گل دکھائیں گلِ خورشید دکھائیں تجھ کو
 ہو مگر عارضِ عالی گلِ بُستانِ قدم غیرِ خاطرِ گلہائے فراویسِ دامن
 گلِ رغنائی خیابانِ گلستانِ ہم بوئے گلِ راحتِ روح و قلوبِ عالم
 فرقتِ دیدار تھا جو اس گلِ محمودی کا
 سرد گلزار کیا آتشِ نمرودی کا

پیاری باتیں

(از حضرت محسن کاکوروی)

اک نظر مہر کی مجھ پر ساقی سرباں تشنہ لبوں پر ہو جا کشتی سے نہ چلی میرے بغیر کروے سرشار مجھے جی بھر کے گردشِ جامِ شرابے ساقی غرق کرتا ہے تلاطم مجھ کو یہ بھی اک وقت ہی بڑھ بھاگ ساقی	ماہر و آئینہ پیکر ساقی دل کی لہروں کا سمندر ہو جا میرے دریا ترے بیڑے کی خیر دے صراحی پہ صراحی بھر کے دم آنے دم آئے ساقی آج لہو کوئی خُسم مجھ کو یار کرتا ہے مخاطب ساقی
--	---

چھینٹے دے دے کے رُلانا ہی مجھے
 ہیں یہ کیا رنگ تمہارے محسن
 نہ وہ صورت نہ وہ سیرت تیری
 اڑ گیا رنگ ترا بو ہو کر
 حیف حالت تری دکھ پائی ہوئی
 لب پہ آئے ہوئے نالے پیہم
 چہرہ ڈوبا ہوا حیرانی میں
 زردی چھائی ہوئی خسار و پیر
 مردنی چھائی ہے چہرہ دیکھو
 چھپ گیا چاند ستارا ہو کر
 ہر دم اک رنگ بدلتا ہی کیوں
 یہ انگ کسے ترے گل کاری کے
 کا مدانی کا پہنسا چھوڑا
 رنگ اڑ اڑ کے بکھر جانے لگا
 بند آنکھیں کیسے روتے دیکھا
 کس بلا کا تو ہوا ہے مجھوں
 کوہ پر جا کے اگر سہارا

غیر بن بن کے بناتا ہے مجھے
 سست کیوں ہو مرے پیارے محسن
 یا کیا ہو گئی حالت تیری
 بہ گیا خون دل، آنسو ہو کر
 ہائے صورت تری مڑھبائی ہوئی
 ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں ہر دم
 عرق آیا ہوا پیشانی میں
 رسول پھولی ہوئی انگاروں پر
 اپنی جاتی ہوئی دنیا دیکھو
 اڑ گیا آئینہ پارا ہو کر
 شمع کی طرح سے جلتا ہی کیوں
 جن کی کلیوں میں جھمکے ہیں کانٹے
 لٹ گیا تیرا شہنا نا جوڑا
 ناقہ ان کو بھی غش آنے لگا
 راس ہم نے سب جتھے سوتے دیکھا
 یسلی کستی ہے بلایں لے لوں
 کو کہن بھی جتھے پتھر مارے

باتیں کرتے ہو تو رُک جاتے ہو
 کبھی ملتے ہو تو بیگانے سے
 شہر کا سیر و تماشا چھوڑا
 رکھ دیے موسمِ گل میں کیونکر
 آشنا گل کے نہ سوسن کے رہے
 بیٹھے جنگل میں نہ یکسو ہو کر
 نجد میں تیرا گلا ہوتا ہے
 کسی بُت نے تجھے حیران کیا
 بیٹھے بھلائے یہ سودا تجھ کو
 دیکھ بھرا میں تری پھر آنکھیں
 خون میں ڈوبی نگاہیں کیسی
 بگڑی کیوں اُمیرے بسلِ حنون
 عشق گیسو نے یہ عقدہ کھولا
 جال پھیلائے ہیں منتر والے
 جان لیتے ہیں نکھرے والے
 دل لگا ہر توپشیمانی کیوں
 آبرو کی جتنے پروا کب تک

آپ ہی چھیڑ کے شرماتے ہو
 کبھی ہنستے ہو تو دیوانے سے
 چاندنی چوک کا رستا چھوڑا
 طاقِ نسیاں پہننے سے سنا
 باغ میں تم تو خزاں بن کے رہے
 کالے کوسوں پھرے آہو ہو کر
 قیس چلے سے خفا ہوتا ہے
 کسی کا فرضے مسلمان کیا
 کیا ہوا میرے کنہیا تجھ کو
 یاد آیں کوئی کافر آنکھیں
 ہیں مری جان یہ آہیں کیسی
 یاد آئی کوئی قاتلِ حنون
 سر پہ چڑھ کر ترے جادو بولا
 بال کھوئے ہوئے گھونگر والے
 تم سلامت رہو مرنے والے
 جان کی فکر مری جانی کیوں
 ننگ و ناموس کا کھٹکا کب تک

ہوش میں آؤ سمجھ والے ہو
 تنو کہیں ایک نہ مانی آخر
 چاندنی پچھلے پہر کی کب تک
 دلِ ناستاد کو رکھ قابو میں
 جھوٹی ٹکھاؤ نہ ہزاروں قسمیں
 حال دشمن کا درگوں ہو جائے
 تھام لے دل، تجھے دلبر کی قسم
 دوستانہ تجھے سمجھاتے ہیں
 بس مجھے آتے ہیں چکر ساقی
 'ننانا' مجھے غش آتا ہے

تم تو بے مئے پیے متوالے ہو
 مٹ گئی تیری جوانی آخر
 روشنی شمع سحر کی کب تک
 نہ سہی یا رہ نہ ہو پہلو میں
 پھینک دو دل جو نہیں ہی بس میں
 کیوں تزا دل میرا غنوں ہو جائے
 سر اٹھا، تجھ کو مرے سر کی قسم
 نہیں سُننا ہی تو ہم جاتے ہیں
 لے مرے ہاتھ سے ساعر ساقی
 دل کہیں اور لیے جاتا ہے

تیری محفل کا یہی طور رہے
 دُور جب تک ہی رہی دُور رہے

طب یونانی اور انگریزی کا ملاپ

(از شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد صاحب)

اور یہ جو کچھ دیکھتے ہو آخری ہی اشتعال
 اب نہ جالینوس کے باؤ ہو اسکی سنبھال

گل ہو اہی چاہتا ہی طب یونان کا چراغ
 یہ عمارت کنگلی سے گل کے آٹا ہو گئی

بے محابا توں سے ٹہری تھیں بخصال
 اپنی چھوٹی مہن کی پرداخت کا مطلق خیال
 ٹکڑے روٹی کے لیے کرتی پھر گھر گھر سوال
 تیرے سٹ جائیں جتنے اور تیری مرجائیں لال
 اٹھ گیا دونوں طرف سے پاس جدا اعتدال
 ورنہ ہوتی خاندان طب کی رسوائی نکال
 اب تو سننے میں نہیں آتی کبھی جنگ و جال
 نے حسد ہی نے گلہ نے شکوہ نے بیج و لال

طلسمہ یونانی وانگریزی کہ دو نہیں ہیں یہ
 گرچہ یونانی بڑی تھی پر نہ تھا اس کے تئیں
 کوستی تھی اور کتنی تھی کہ تو ہو جائے رائے
 چھوٹی کھوٹی طرف سے بول اٹھی کہ بس کب بک کر
 جبہ روٹوں میں پہنی تھکا تھکا خینخت سفدر
 بارے دونوں کو کسٹھ سے گلے ملو ادیا
 دو رہو کر غائب پھر ہو گیا گراما پ
 اس طرح ایک ہی جگہ میں دونوں گھر آ جا رہیں

بابۃ
 —————
 م



